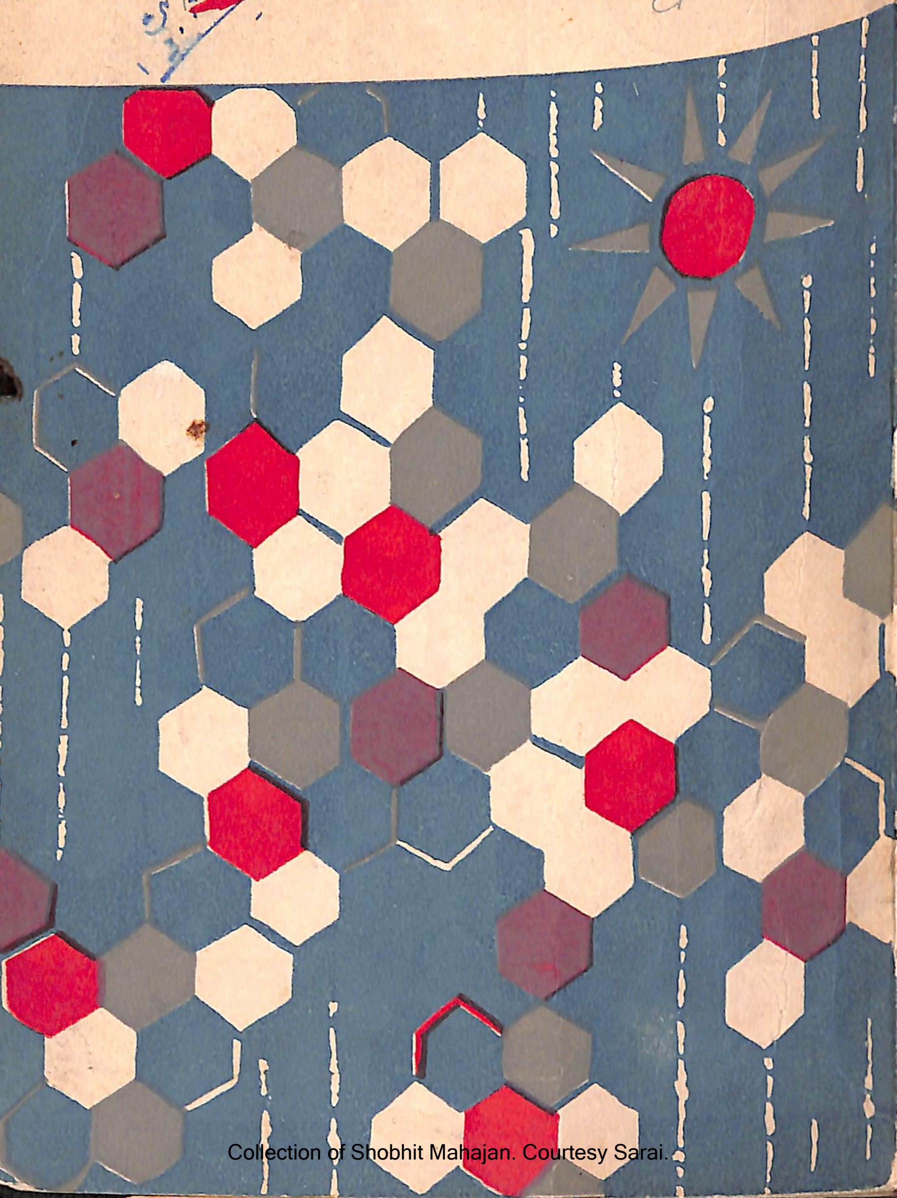
شاہکار



دلچسپ تحریروں کا انتخاب

شاہکار

شمارہ ——— ۴۶

مجلسِ مشاورت

سید احتشام حسین
خواجہ احمد عباس
مہندر ناتھ
خلیل الرحمٰن اعظمی
مظفر شاہجہانپوری



مدیر ——— محمود احمد ہنر

ایک سال کیلئے ——— دس روپیہ
ایک رسالہ ——— ایک روپیہ

آفس ——— ممتاز باغ، لوکرگنج، الہ آباد ۳

بمبئی آفس ——— ڈائمنڈ لاج، سکندر پیر خاں اسٹریٹ بمبئی ۸

اپنی بات

ہندوستان میں لسانی بنیاد پر ایک اور نئے صوبے کے قیام کا اعلان ہو گیا۔ اب پنجاب کی مزید تقسیم ہو گی لیکن ایک ایسی ریاست بن جائے گی جہاں کی سرکاری زبان پنجابی ہو گی اور رسم الخط گورمکھی۔

ہمیں پنجابی زبان کے حامیوں سے ہمیشہ ہمدردی رہی کیونکہ ان کا مطالبہ معقولیت پر مبنی تھا اور اسی لیے ہم انھیں اس عظیم کامیابی پر دلی مبارکباد دیتے ہیں۔

یوں تو پورے پنجاب میں پنجابی ہی بولی جاتی تھی لیکن سرکاری زبان اردو ہی تھی۔ آج بھی بیشتر کام اردو میں ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ پنجابی اور ہندی کی قلمی لڑائی بھی اردو ہی میں لڑی گئی کیونکہ سکھوں اور ہندوؤں کے کثیر الاشاعت اخبارات اسی زبان میں شایع ہوتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ ہریانہ اور پنجابی صوبہ دونوں ریاستوں میں اردو کو اس کا جائز مقام دیا جائے گا اور دونوں اردو کے اس احسان کو یاد رکھیں گے کہ اس زبان کے ذریعے انھوں نے اپنے معرکے اور مورچے فتح کیے ہیں۔

اس سال ساہتیہ اکادمی نے سردار راجندر سنگھ بیدی کو ان کی تصنیف "ایک چادر میلی سی" پر اردو کا اعلیٰ ترین ادبی اعزاز عطا کیا ہے۔ اس سے قبل سنگیت ناٹک اکادمی جناب اُپندر ناتھ اشک کو بہترین ڈراما نگار کی حیثیت سے یہ اعزاز دے چکی ہے۔ ہم دونوں اصحاب کی خدمت میں مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ یہ دونوں ادیب پنجابی ہیں لیکن دونوں نے اردو میں لکھنا شروع کیا اور اردو ادب میں ممتاز مقام حاصل کیا۔ اگرچہ اشک صاحب کو ہندی ڈراما نگار کی حیثیت سے اعزاز دیا گیا ہے لیکن بنیادی طور پر وہ اردو ہی کے ادیب ہیں اور اب بھی اردو میں لکھتے رہتے ہیں۔

پنجابی زبان کے حامیوں نے اپنی زبان اور رسم الخط کے تحفظ کے لیے جو جد و جہد کی اور جو شاندار کامیابی حاصل کی اس سے خاص طور پر اردو کے حامیوں کو سبق لینا چاہیے۔ ہندی کے بعد اس ملک کی سب سے بڑی زبان اردو ہی ہے اور اکثر غیر ہندی صوبوں میں اسے خاصی مراعات بھی حاصل ہیں لیکن اتر پردیش جو اردو کا گھر ہے وہاں اسے غریب الوطن بنا دیا گیا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اردو والے اب بھی اگر پنجابی کے حامیوں کی طرح اپنے حق کے لیے جد و جہد شروع کر دیں تو کوئی وجہ نہیں کہ انھیں کامیابی نہ حاصل ہو۔ کاش حامیانِ اردو عمل و ایثار کے لیے بھی تیار ہو سکیں! —— محمود احمد ہنر

ترتیب

اپنی بات .... محمود احمد ہنر

تصویر .... غیاث احمد گدی

افسانے

۱ - احمد ندیم قاسمی .. ہیروشیما سے پہلے ہیروشیما کے بعد .. آبلے .. ۵

۲ - احمد شریف .. بے آباد جزیرے .. .. نقوش، لاہور .. ۳۹

۳ - اقبال متین .. زمین کا درد .. .. نقوش لاہور .. ۵۱

۴ - غیاث احمد گدی .. ڈوروتھی جون سین .. سیپ، کراچی .. ۶۳

۵ - آغا بابر .. نیم کے پتے .. .. نقوش، لاہور .. ۷۷

۶ - شہزاد اختر .. بات اک رات کی .. .. لیل و نہار، لاہور .. ۸۶

نظمیں

۷ - مخدوم محی الدین .. وقت — بے درد مسیحا .. خاتون دکن، حیدرآباد .. ۹۵

۸ - فیض احمد فیض .. ملاقات مری .. دست تہ سنگ، مجموعۂ کلام .. ۹۶

۹ - اختر الایمان .. جب اور اب، اتفاق .. یادیں، مجموعۂ کلام .. ۹۶

۱۰ - سردار جعفری .. سو رنگ، جام محبت .. ایک خواب اور، مجموعۂ کلام .. ۹۷

۱۱ - احمد ندیم قاسمی .. یہ عجب شب ہے .. نقوش، لاہور .. ۹۸

۱۲ - احمد ندیم قاسمی .. بہار .. دشت وفا، مجموعۂ کلام .. ۹۸

۱۳ - عبد الحمید عدم .. خم کدہ .. نقوش، لاہور .. ۹۹

۱۴ - سلام مچھلی شہری .. صبح امن .. ہماری زبان، علی گڈھ .. ۹۹

۱۵ - ظہور نظر .. سچا جھوٹ .. فنون، لاہور .. ۱۰۰

۱۶ - شاذ تمکنت .. جذب و گریز .. فنون، لاہور .. ۱۰۰

۱۷ - احسن احمد اشک .. رقص، بے گناہی .. جاگتے جزیرے، مجموعۂ کلام .. ۱۰۱

۱۸ - انوار انجم .. اک بوند لہو کی .. نقوش، لاہور .. ۱۰۲

۱۹ - شہریار .. ایک دو جام .. اسم اعظم، مجموعۂ کلام .. ۱۰۲

۲۰ - افتخار اعظمی .. رہنما .. بلٹز، بمبئی .. ۱۰۳

مضمون

۲۱ - فراق گورکھپوری .. میری شاعری پر انگریزی ادب کا اثر .. آجکل، دہلی .. ۱۰۴

غزلیں

۲۲ - عابد علی عابد .. فنون .. .. لاہور .. ۱۲۷
۲۳ - ماہر القادری .. شاعر .. .. بمبئی .. ۱۲۷
۲۴ - احمد ندیم قاسمی .. فنون .. .. لاہور .. ۱۲۸
۲۵ - خلیل الرحمٰن اعظمی .. پونم .. .. حیدر آباد .. ۱۲۹
۲۶ - ناصر کاظمی .. فنون .. .. لاہور .. ۱۲۹
۲۷ - مظہر امام .. صبح نو .. .. پٹنہ .. ۱۳۰
۲۸ - زبیر رضوی .. ادبی دنیا .. .. لاہور .. ۱۳۰
۲۹ - اختر ہوشیار پوری .. نقوش .. .. لاہور .. ۱۳۱
۳۰ - کمار پاشی .. تحریک .. .. دہلی .. ۱۳۲
۳۱ - اختر نظمی .. بیسویں صدی .. .. دہلی .. ۱۳۲
۳۲ - مظفر حنفی .. سب رس .. .. حیدر آباد .. ۱۳۳
۳۳ - اخگر مشتاق .. بیسویں صدی .. .. دہلی .. ۱۳۳
۳۴ - منظور عارف .. فنون .. .. لاہور .. ۱۳۴
۳۵ - شہزاد اختر .. فنون .. .. لاہور .. ۱۳۴
۳۶ - شمیم حنفی .. سیپ .. .. کراچی .. ۳۵
۳۷ - وقار خلیل .. جوار بھاٹا .. .. دہلی .. ۱۳۵
۳۸ - کیف احمد صدیقی .. تلاش .. .. دہلی .. ۱۳۶
۳۹ - قمر اقبال .. تحریک .. .. دہلی .. ۱۳۶

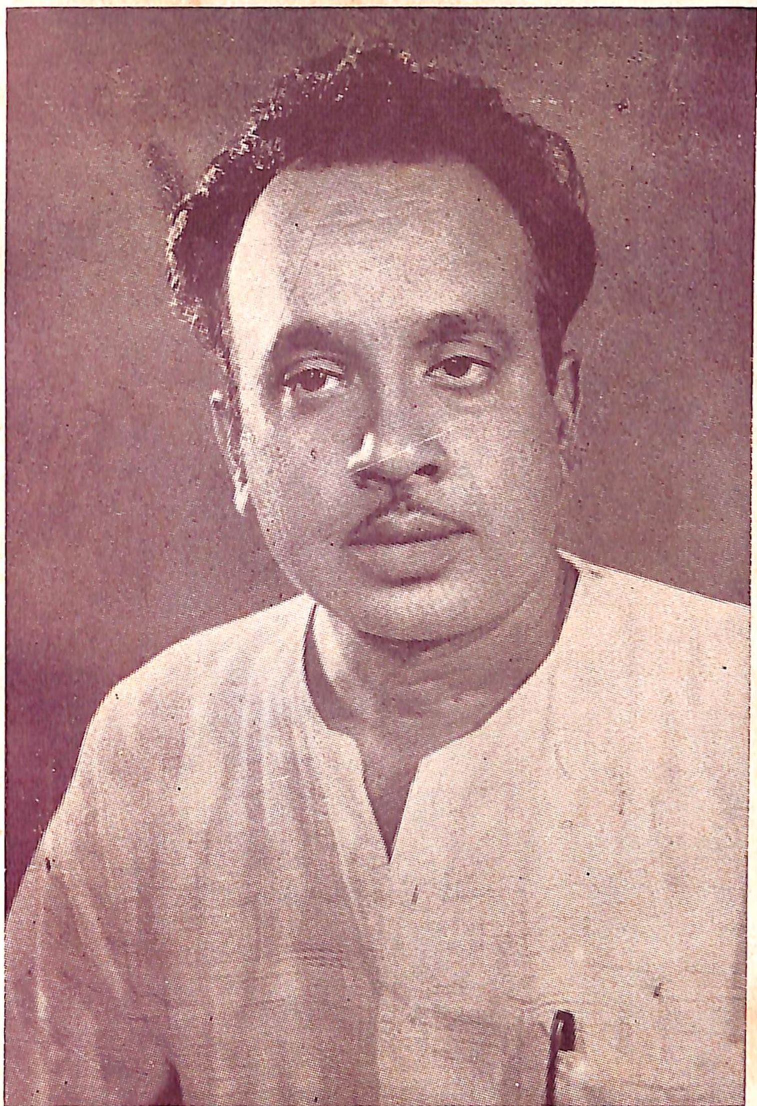
طنز و مزاح

۴۰ - شفیق الرحمن .. کون .. پچھتاوے، لاہور .. ۱۳۸
۴۱ - رضا نقوی واہی .. الزام .. کوہکن، پٹنہ ۱۳۹
۴۲ - شاہد صدیقی .. الیکشن .. قومی آواز، لکھنؤ ۱۴۰

تبصرے

شمیم حنفی ۱۴۱
محبوب اللہ مجیب ۱۴۲

ممتاز الحق پرنٹر و پبلشر نے اسرار کریمی پریس الہ آباد میں چھپوا کر دفتر "شاہکار" ممتاز باغ،
لوکر گنج الہ آباد سے شائع کیا



احمد ندیم قاسمی

ہیروشیما سے پہلے۔ ہیروشیما کے بعد

لوگ کہتے تھے شمشیر خاں وقت سے پہلے بوڑھا ہو گیا ہے۔ اُس کی طبیعت کا تقاضہ یہی تھا کہ اس کا چہرہ روشن اور اس کی داڑھی سیاہ رہے لیکن کچھ دنوں سے بڑھاپا اس پہ اچانک برف کی طرح گرنا شروع ہوا، اور اس کے سر کے بالوں اور داڑھی مونچھوں کو کھچڑی بنا گیا۔ بڑھاپے کی یہ آسیبی سفیدی اس کے لباس پہ اثر انداز ہوئی، بنارسی پگڑیوں، ریشمی لنگیوں اور بوسکی کے کھلے اور ڈھیلے ڈھالے چولوں کی جگہ ململ کے چھینٹوں، ٹخنوں سے بالشت بھر اونچے تہبندوں اور کھدر کی کسی کسائی بنگالی قمیصوں نے لے لی۔ چہرے کی لالی نچڑ گئی اور آنکھوں کے کناروں پر مکڑیوں نے ٹانگیں پسار دیں۔ اس انقلاب کے باوجود بچوں سے لے کر بوڑھوں تک اور کنواریوں سے لے کر بیواؤں تک اس کی چھیڑ چھاڑ بدستور جاری رہی بلکہ کچھ زیادہ ہی شدت اختیار کر گئی۔ جب وہ گلی کے نکڑ پہ تیزی سے گزرتے ہوئے کسی نوجوان پر پھبتی کستا "ارے بھئی، وہ تو پنگھٹ پر جا چکی" یا چوپال کی پرلی طرف قبرستان کے ایک ویران گوشے میں کسی گبرو کو دبکتا دیکھ کر پکار اٹھتا "آج گاڑی لیٹ معلوم ہوتی ہے"، تو لوگ بے اختیار ہنستے، اور خود شمشیر کے قہقہے ان سب سے بلند ہوتے۔ مگر ہر روز کوئی اس کی دکھتی رگ کو چھیڑ دیتا "شمشیر چچا نہ جانے کیا بات ہے کہ پہلے تم ہنستے تھے تو یوں لگتا تھا جیسے کٹورے بج رہے ہوں، اور اب تم ہنستے ہو تو یوں لگتا ہے جیسے چٹانیں لڑھک رہی ہوں پربت پر سے، اور پھر نہ تمھاری آنکھیں چمکتی ہیں، نہ چہرہ دمکتا ہے۔ تم

ہنستے ہو تو تمھارے پپڑائے ہونٹوں سے خون رسنے لگتا ہے، تمھارے ماتھے کی لکیریں گہری ہو ہو جاتی ہیں، آخر کیا بپتا پڑی ہمارے چچا پر کہ دنوں میں بجھ کر رہ گیا۔"

پربت کی چوٹی پر سے لڑھکتی ہوئی چٹانوں کا تانتا بندھ جاتا اور وہ کہتا۔" یعنی مطلب یہ ہے تمھارا کہ ہم بوڑھے سرے سے ہنسنا ہی چھوڑ دیں، اور یہ نعمت بھی تم نوجوانوں کو سونپ دیں۔ کیوں بھئی! ہم نے کیا بگاڑا ہے تمھارا؟ ہم نے تمھیں سپرد کر رکھی ہیں محبتیں اور راتوں کی ملاقاتیں اور تنہائیوں کے گیت اور لال چہرے اور لَو دیتی ہتھیلیاں۔ اب یہ ہنسی بھی چھین لو ہم سے کہ ہم سچ مچ کے بے حیا بن کر رہ جائیں۔ واہ! ــــ اور بھئی، یہ ایک کان سے عطر کی پھریری نکال کر ہمیں بھی تو سنگھاؤ، کہتے ہیں جس نے حنا کا عطر نہیں سونگھا اسے ماں نے ابھی جنا ہی نہیں ــــ" اور چٹانوں کا ایک اور ریلا گڑگڑاتا ہوا امڈ پڑتا۔

لیکن لوگوں کا اندازہ غلط نہ تھا، اگرچہ وہ اس کی وجہ نہیں جانتے تھے، انھیں یہ معلوم نہیں تھا کہ اپنے بیٹے دلیر خاں کی شادی پر اس نے محض دکھاوے کی خاطر جو دھوم مچائی تھی اور سونے چاندی کے زیوروں کے جو انبار لگا دیئے تھے وہ درحقیقت مہاجن کی بھرپور محبت کا نتیجہ تھے، اور شہنائیوں اور گیتوں اور تہنیتوں کے ہنگامے کے بعد جب اس نے حالات کا جائزہ لیا تھا تو ایک رات گھبرا کر پکار اٹھا تھا" دلیر خاں دیا بجھا دو بھئی، تیل خواہ مخواہ جل رہا ہے۔"

ملحقہ کمرے کے دروازے کی روشن جھریاں اچانک مٹ گئیں اور اس نے لحاف لپیٹ کر سونے کی کوشش کرنا چاہی، مگر کروٹوں کے بہت سے دائرے بنانے کے بعد وہ اٹھ بیٹھا۔ اسے اندھیرے سے ہول آنے لگا۔ طاق پر سے دیا سلائی کی ڈبیا اٹھا کر اس نے چراغ جلایا تو ملحقہ کمرے سے آواز آئی" کیا بات ہے ابا؟" ــــ اور وہ جھنجھلا کر بولا۔ " ارے ابھی تک جاگ رہے ہو تم؟" ــــ اور اس نے دیا بجھا کر لحاف کی پناہ ڈھونڈی۔

بار بار اس کے دماغ کو اس احساس کی ان گنت سوئیاں کریدنے لگتیں، کہ وہ اپنی اچھی خاصی پونجی کو برباد کرنے کے علاوہ تین ہزار کا مقروض ہے اور اب اس کا بیٹا نوجوان

ہے، اس کی شادی بھی ہو چکی ہے۔ اب اس کے بچے ہونے لگیں گے، اخراجات بڑھتے جائیں گے اور زمینیں اجڑتی جائیں گی۔ پہلے سندھ کے پانیوں سے اسکی زمینوں پر ہر سال زندگی کی تازہ تہیں پھیل جاتی تھیں۔ ان لوگوں پر اسے بہت ترس آتا تھا جن کی زمینیں دریا سے دور تھیں، جو ہمیشہ بارشوں کے محتاج رہتے تھے۔ بارشوں کے لیے مسجدوں میں دعائیں مانگتے تھے، غریبوں میں گڑ اور گھنگھنیاں بانٹتے تھے، نفل پڑھتے تھے اور پھر مایوس ہو کر گالیاں بکنے لگتے تھے۔ لیکن اب سندھ سے ایک بہت بڑی نہر نکالی جا رہی تھی اور دریا سمٹ اور ہٹ کر بہت دور بھورے پہاڑوں کے قدموں میں رینگ رہا تھا۔ چٹخی ہوئی شور زمینوں پر جب وہ کہیں کا اِکا دکا پودا دیکھتا، اور ڈھور ڈنگر ان دور دور تک بکھرے ہوئے پودوں کی تلاش میں مارے مارے پھرتے تو وہ بہت دکھی ہو جاتا۔ زمینیں روز بروز بگڑتی اور اجڑتی جا رہی تھیں، اور سندھ کا پانی ان وسیع تھلوں کے صدیوں کے سوکھے سڑے معدوں میں غرق ہو رہا تھا، جن پر نوابوں اور جاگیرداروں کا قبضہ تھا اور جو ان تھلوں سے بے گانہ رہ کر پہلے سے زیادہ شاداب ریاستوں کے مالک تھے۔

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔" اس نے ایک روز ذیلدار سے کہا تھا۔ "کچھ پتے نہیں پڑتا کہ ایک ہزار غریب کسانوں کی زمین کو اجاڑ کر صرف ایک زمیندار کی آسودگی کا سامان کیوں ہو رہا ہے۔ بھئی یہ بات عجیب الٹی سی ہے، خدا کی ان نعمتوں میں تو ہر انسان برابر کا حصہ دار ہے۔ دریا کے پانیوں پر بھی کبھی کسی کا قبضہ ہوا ہے بھئی ذیلدار؟"

ذیلدار ورثے میں پائی ہوئی نیازمندی کا مظاہرہ کرتا۔ "شمشیر خاں سرکار جو چاہے کرے، چاہے تو تھلوں میں دریا بہا دے، چاہے تو ہرے بھرے کھیتوں میں آگ لگا دے۔ ایسی باتیں یوں کھل کر نہ کیا کرو۔ سرکار کو پتہ چلا تو دھر لیے جاؤ گے اور بھئی خدا اور سرکار پر کون انگلی اٹھائے؟"

"مگر دریا کے پانی پر کسی کا اجارہ تھوڑا ہے؟" وہ حیران ہو کر کہتا۔

"سرکار چاہے تو ہوا پر بھی لگان لگا دے؟" ذیلدار حسب عادت سرکار کی وکالت کرتا۔

ہنستے ہو تو تمھارے پپڑائے ہونٹوں سے خون رسنے لگتا ہے، تمھارے ماتھے کی لکیریں گہری ہو ہو جاتی ہیں، آخر کیا بیتا پڑی ہمارے چچا پر کہ دنوں میں بجھ کر رہ گیا۔"

پربت کی چوٹی پر سے لڑھکتی ہوئی چٹانوں کا تانتا بندھ جاتا اور وہ کہتا۔" یعنی مطلب یہ ہے تمھارا کہ ہم بوڑھے سرے سے ہنسنا ہی چھوڑ دیں، اور یہ نعمت بھی تم نوجوانوں کو سونپ دیں۔ کیوں بھئی! ہم نے کیا بگاڑا ہے تمھارا؟ ہم نے تمہیں سپرد کر رکھی ہیں محبتیں اور راتوں کی ملاقاتیں اور تنہائیوں کے گیت اور لال چہرے اور لو دیتی پتلیاں۔ اب یہ ہنسی بھی چھین لو ہم سے کہ ہم بیچ بیچ کے بے حیا بن کر رہ جائیں۔ واہ! ـــــ اور بھئی، یہ ایک کان سے عطر کی پھریری نکال کر ہمیں بھی تو سنگھاؤ، کہتے ہیں جس نے حنا کا عطر نہیں سونگھا اسے ماں نے ابھی جنا ہی نہیں ـــــ" اور چٹانوں کا ایک اور ریلا گڑگڑاتا ہوا امڈ پڑتا۔

لیکن لوگوں کا اندازہ غلط نہ تھا، اگرچہ وہ اس کی وجہ نہیں جانتے تھے، انھیں یہ معلوم نہیں تھا کہ اپنے بیٹے دلیر خاں کی شادی پر اس نے محض دکھاوے کی خاطر جو دھوم مچائی تھی اور سونے چاندی کے زیوروں کے جو انبار لگا دیئے تھے وہ درحقیقت مہاجن کی بھرپور محبت کا نتیجہ تھے، اور شہنائیوں اور گیتوں اور تہنیتوں کے ہنگامے کے بعد جب اس نے حالات کا جائزہ لیا تھا تو ایک رات گھبرا کر پکار اٹھا تھا۔" دلیر خاں دیا بجھا دو بھئی، تیل خواہ مخواہ جل رہا ہے۔"

ملحقہ کمرے کے دروازے کی روشن جھریاں اچانک مٹ گئیں اور اس نے لحاف لپیٹ کر سونے کی کوشش کرنا چاہی۔ مگر کروٹوں کے بہت سے دائرے بنانے کے بعد وہ اٹھ بیٹھا۔ اسے اندھیرے سے ہول آنے لگا۔ طاق پر سے دیا سلائی کی ڈبیا اٹھا کر اس نے چراغ جلایا تو ملحقہ کمرے سے آواز آئی۔" کیا بات ہے ابا؟" ـــــ اور وہ جھنجھلا کر بولا۔ "ارے ابھی تک جاگ رہے ہو تم؟" ـــــ اور اس نے دیا بجھا کر لحاف کی پناہ ڈھونڈی۔

بار بار اس کے دماغ کو اس احساس کی ان گنت سوئیاں کریدنے لگتیں، کہ وہ اپنی اچھی خاصی پونجی کو برباد کرنے کے علاوہ تین ہزار کا مقروض ہے اور اب اس کا بیٹا نوجوان

ہے، اس کی شادی بھی ہو چکی ہے۔ اب اس کے بچے ہونے لگیں گے، اخراجات بڑھتے جائیں گے اور زمینیں اجڑتی جائیں گی۔ پہلے سندھ کے پانیوں سے اسکی زمینوں پر ہر سال زندگی کی تازہ تہیں پھیل جاتی تھیں۔ ان لوگوں پر اسے بہت ترس آتا تھا جن کی زمینیں دریا سے دور تھیں، جو ہمیشہ بارشوں کے محتاج رہتے تھے۔ بارشوں کے لیے مسجدوں میں دعائیں مانگتے تھے، غریبوں میں گڑ اور گھنگھنیاں بانٹتے تھے، نفل پڑھتے تھے اور پھر مایوس ہو کر گالیاں بکنے لگتے تھے۔ لیکن اب سندھ سے ایک بہت بڑی نہر نکالی جا رہی تھی اور دریا سمٹ اور ہٹ کر بہت دور کھورے پہاڑوں کے قدموں میں رینگ رہا تھا۔ چٹخی ہوئی شور زمینوں پر جب وہ مٹر کا اکا دکا پودا دیکھتا، اور ڈھور ڈنگر ان دور دور تک بکھرے ہوئے پودوں کی تلاش میں مارے مارے پھرتے تو وہ بہت دکھی ہو جاتا۔ زمینیں روز بروز بگڑتی اور اجڑتی جا رہی تھیں، اور سندھ کا پانی ان وسیع تھلوں کے صدیوں کے سوکھے سڑے معدوں میں غرق ہو رہا تھا، جن پر نوابوں اور جاگیرداروں کا قبضہ تھا اور جو ان تھلوں سے بیگانہ رہ کر پہلے سے زیادہ شاداب ریاستوں کے مالک تھے۔

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا" اس نے ایک روز ذیل دار سے کہا تھا۔ "کچھ پلے نہیں پڑتا کہ ایک ہزار غریب کسانوں کی زمین کو اجاڑ کر صرف ایک زمیندار کی آسودگی کا سامان کیوں ہو رہا ہے۔ بھئی یہ بات عجیب الٹی سی ہے، خدا کی ان نعمتوں میں تو ہر انسان برابر کا حصہ دار ہے۔ دریا کے پانیوں پر بھی کبھی کسی کا قبضہ ہوا ہے بھئی ذیلدار؟"

ذیلدار ورثے میں پائی ہوئی نیاز مندی کا مظاہرہ کرتا "شمشیر خاں سرکار جو چاہے کرے، چاہے تو تھلوں میں دریا بہا دے، چاہے تو ہرے بھرے کھیتوں میں آگ لگا دے۔ ایسی باتیں یوں کھل کر نہ کیا کرو۔ سرکار کو پتہ چلا تو دھر لیے جاؤ گے اور بھئی خدا اور سرکار پر کون انگلی اٹھائے؟"

"مگر دریا کے پانی پر کسی کا اجارہ تھوڑا ہے؟" وہ حیران ہو کر کہتا۔

"سرکار چاہے تو ہوا پر بھی لگان لگا دے" ذیلدار حسب عادت سرکار کی وکالت کرتا۔

اور پھر شمشیر خاں کے دماغ میں خوش مزاجی کی رَو چلنے لگتی۔" ہوا پر بھی لگان ؟ بھئی سچ مچ اگر سرکار ہوا پر بھی لگان لگا دے تو عجیب تڑک پھڑک شروع ہو جائے، ہر پل واویلا مچا رہے۔ ارے بھئی کیا ہوا؟ کیسا شور ہے؟ ۔ کچھ نہیں بھئی، ادھر اس گھر میں ہوا ختم ہو گئی ہے، سارے گھر والے تڑپ رہے ہیں۔ پانسو کے نوٹ دے کر میراسی کو شہر بھجوایا ہے کہ سرکار سے ہوا کے کنستر خرید لائے —— ہائے ہائے ہائے! پھر ذیلدار۔ ایک بات کہوں یہ سامنے دادا شہباز بیٹھا ہے نا۔ ہوا پر لگان لگے تو سب سے پہلے یہی دم توڑے کا بے چارا!"

"کیوں؟" کوئی سوال کرتا۔

"ایک تو غریب ہے۔ صبح کی بگھاری ہوئی دال دوسرے دن شام تک چلتی ہے، اور پھر دمہ کا مریض ہے۔ ادھر ہوا بند ہوئی ادھر دادا شہباز انا للّٰہ ہوئے، کیوں دادا؟"

دادا شہباز پنشنر جو بڑھاپے کے آخری نقطے کو چھونے کے باوجود سچی بات اور مذاق سے باز نہ آتا تھا۔ پوپلے منہ کو کھیا کر کہتا "ہم تو بھئی مٹکا بھر لیں گے ہوا سے اور چھپا دیں گے اسے کوڑے کے ڈھیر میں، جب بھی ہوا نہ ملی تو کوڑا ہٹایا مٹکے پر سے ڈھکنا کھسکایا، پھیپھڑے بھر لیے اور پھر مٹکا بند۔ تجھے ایک بوند بھی دیں تو نام بدل ڈالنا۔ کنکوار کھ دینا، ہاں!" قہقہے پڑتے، تمباکو کے دھوئیں اڑتے، کھانسیوں کے پٹاخے چھوٹتے۔ شمشیر ہر کسی پر پھبتی کستا" ابے آرام سے کھانس ایسی کھانسی بھی کیا جیسے اونٹ کا گھٹنا ٹوٹے —— ابے حقہ ادھر تھما، جورو کی طرح لپٹ جاتا ہے اس سے —— ابے سنبھل کر بیٹھ، تو نے تو دکان کھول رکھی ہے!" —— مگر جب وہ گھر آتا تو تھلتھلاتے ہوئے پیٹ والا مہاجن دوہری ٹھوڑی میں تہرے بل ڈال کر اس کے کمرے میں کسی جھری کے رستے آنکلتا، اور اندھیرے میں سوکھے سڑے پنجے اس کی طرف لپکتے، اور ملحقہ کمرے کی روشن جھریاں بل کھا کر سانپوں کی طرح رینگنے لگتیں۔" دیا بجھا دو دلیر!" وہ پکار اٹھتا "تیل ضایع ہو رہا

ہے "—— اپنی ہی آواز سن کر وہ چونک اٹھتا، آدھی رات کو اٹھ کر صندوق کھولتا کہ شاید کسی کونے میں کپڑے کی کسی سلوٹ میں کوئی نوٹ اٹک کر رہ گیا ہو، اور پھر لحاف کی پناہ گاہ میں گھس جاتا —— صبح اٹھتا تو اس کی کنپٹیوں پہ بالوں کا ایک اور گچھا بھوسلا رنگ اختیار کر چکا ہوتا۔

"یعنی ہم بوڑھے ہو رہے ہیں" اس نے ایک روز سوچا اور بنارسی پگڑی اتار کر پلنگ پہ پٹخ دی۔ اس کے بعد ہر روز سفیدی بوقلمونی کی جگہ لیتی لئی اور لوگ حیران ہونے لگے کہ شمشیر پر بڑھاپا اچانک پہاڑ کی طرح کیوں ٹوٹ پڑا۔

ایک روز پٹواری نے چوپال پہ آکر خبر دی کہ انگریز نے جرمن کے خلاف لڑائی کا اعلان کر دیا ہے، کمزور قوموں کی حفاظت کے لیے۔ شمشیر کی آنکھیں چمک اٹھیں، خلافِ معمول اتنے بڑے واقعہ پہ خیال آرائی نہ کی بلکہ چپ چاپ بیٹھا رہا۔ چہرے پر کئی رنگ آئے، گئے اور پھر آ گئے۔ آخر اٹھا، لپک کر گھر آیا اور دلیر کو الگ لے جا کر کہا "لام چھڑ گئی، تو نے اس روز کہا تھا کہ انگریزوں کا چھتری والا وزیر خوا مخواہ جرمن کو راضی کرنے کی دوڑ دھوپ کر رہا ہے۔ تو نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ شکر ہے، تو نے مڈل تو پاس کر لیا، ورنہ ہم ان پڑھ لوگ تو ساری عمر اندھیر نگری میں بسر کر دیتے ہیں۔ تو بات یہ ہے دلیر بیٹا۔۔۔"

اس نے ہزار چاہا کہ اعصاب کو قابو میں رکھے، اس کا رنگ نہ بدلے، اس کے ہونٹ نہ کانپیں، اس کی بھویں نہ لرزیں مگر اس وقت اس کی ذاتی غرض نے شفقتِ پدری کے خلاف لڑائی کا اعلان کر دیا تھا۔ ایک دم رُک کر وہ سیدھا ہو بیٹھا، اور پھر یوں بولا جیسے اس نے ساری عبارت برسوں سے رٹ رکھی تھی "بات یہ ہے دلیر بیٹا کہ پچھلی لام میں جو پڑھا لکھا نوجوان فوج میں بھرتی ہوا وہ واپس آکر تحصیلدار اور صاحب ضلع اور کپتان پولیس بنا۔ ایسے بھی کئی منصف میں نے دیکھے ہیں جو بات کرتے تھے تو یوں معلوم ہوتا تھا جیسے فوج کو حملہ کا حکم دے رہے ہوں —— تو اب میرے خیال میں اللہ کا نام لے اور بھرتی ہو جا۔ موت سے ڈرنا جوان مردوں کا کام نہیں، یہ گھڑی تو مقرر ہے۔

ٹالے ٹل نہیں سکتی۔ جنگ کے طوفان سے لاکھوں بچ کر نکل آتے ہیں، اور یہاں کروڑوں کچا خربوزہ کھا کر یا چربی کا حلوہ ٹھونس کر یا ویسے ہی بیٹھے بٹھائے ہنستے کھیلتے دم توڑ دیتے ہیں۔ چل چلاؤ تو لگا ہی رہتا ہے۔ تو پھر میرے بیٹے، میں چاہتا ہوں کہ جب تو لام سے واپس آئے تو بہت بڑا افسر بن کر آئے۔ لوگ تیرا نام لیں تو میں فخر سے اکڑ جاؤں۔ یقین جانو، اس طرح میرے سفید ہوتے ہوئے بال پھر سے کالے ہونے لگیں گے، دل کا اطمینان سب سے بڑا خضاب ہے۔"

دلیر خاں فوجی سپاہیوں کے کھڑکھڑاتے ہوئے تہبند، دو گھوڑا بوسکی کی قمیص، بنارسی پگڑیاں اور پھر عطر کی پھریریاں اور انگلیوں میں ناچتا ہوا بیک سا بید، کلائی پر گھڑی اور ان سب پر مستزاد فوں خاں اور ٹخ ٹخ —— غرض ہر بات سے متاثر تھا اور یہ تاثرات اس وقت بہت گہرے ہو جاتے تھے جب گاؤں کی ہر اٹھتی جوانی عطر کی خوشبو اور انگریزی قسم کی نسواری مٹھائیوں کے چکر میں آکر محض فوجیوں ہی کا اجارہ بن چلی تھی۔ ساتھ ہی اسے باپ کے قبل از وقت بڑھاپے کا بھی علم تھا اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ رات کو گھر میں دیر تک چراغ جلانے کی ممانعت کیوں ہے!

مگر ابھی شاداں کے ناخنوں پہ حنا کی ہلکی ہلکی لالی مٹنے نہیں پائی تھی، اگرچہ اس نے شادی کے دس روز بعد ہی سارے گھر کا کام سنبھال لیا اور نئی نویلی سہاگنوں کے برلنے رواجوں کے برعکس گھر کی جھاڑ پونچھ کے علاوہ تالاب سے سب گھر والوں کے کپڑے تک دھو لاتی تھی۔ لیکن آخر وہ ابھی دلہن تھی۔ اس کی چوڑیوں کے چھنا کے میں ترنم تھا۔ اس کی آواز کی نرمی میں تازہ خون کی طراری متر نم دھڑکنیں سی پیدا کرتی تھی۔ وہ قدم اٹھاتی تھی تو یوں معلوم ہوتا تھا جیسے دوسرا قدم زمین پر نہیں آئے گا ہوا میں پڑے گا، اور وہ ابھر جائے گی اور ابھرتی چلی جائے گی۔ اس کی لانبی آنکھوں کو سرمے کی لکیر ابھی تک نیم خوابی کا خمار بخشے جا رہی تھی۔ شرماتے وقت ابھی تک اس کا دایاں ابرو اوپر اٹھ کر کمان کا سا خم کھا جاتا تھا، اور گوری ٹھوڑی کی گولائی حباب کی طرح کپکپا اٹھتی تھی، دلیر خاں کے نزدیک

اتنے بڑے سرمائے کو کھلا چھوڑ دینا بزدلی تھی۔ لیکن جب اعلان جنگ کے ساتھ ہی گاؤں نوجوانوں سے خالی ہونا شروع ہوا، اور چند لوگوں نے اس کی ہچکچاہٹ پر پھبتیاں بھی کسیں، تو وہ ایک صبح کو اپنے باپ سے آنسوؤں سے بھیگی ہوئی دعائیں لیتا اور شاداں کے سلگتے ہوئے لبوں کے گہرے گوشوں کا آبِ حیات پیتا گاؤں سے رخصت ہوگیا۔

دلیر خاں کے جاتے ہی گھر خالی خالی نظر آنے لگا۔ شاداں بھی اداس رہنے لگی۔ ہر وقت پڑی کھاٹ توڑ رہی ہے۔ برتنوں پر چڑیاں ناچ رہی ہیں۔ آنگن میں کوؤں نے اودھم مچا رکھا ہے۔ سلیقے اور سگھڑاپے کا سارا سحر ٹوٹ گیا۔ زیور اترنے لگے۔ ریشمی لہنگے کا کنارا زمین پر گھسٹتے گھسٹتے بے رنگ ہوگیا۔ آنکھوں میں کبھولے سے سرمہ پڑتا بھی تو دن ڈھلے تک بہہ جاتا۔ شمشیر اسے دلاسا دینے کی کوشش کرتا۔ مگر جانتا تھا کہ جوانی میں محبت عبادت کی حیثیت رکھتی ہے، اور پھر شاداں تو ویسے ہی مجبور ہے۔ اُسے بہت زیادہ کام نہیں کرنا چاہئے —— لیکن یہ اداسی، یہ آنسو، یہ جمائیاں —— "شاداں بیٹی! یہ برا شگون ہے۔ جوان مردوں کا کوئی وطن نہیں ہوتا۔ وہ عمر بھر نکھٹو بن کر گھر میں پڑے نہیں رہ سکتے۔ خدا کے لیے ہنس کھیل مسکرا —— سنتی ہے شاداں بیٹی؟"

شاداں شمشیر کی طرف یوں دیکھتی جیسے کہہ رہی ہو "ٹھیک ہے ہنسنا کھیلنا بڑی اچھی باتیں ہیں، مگر کس سے ہنسوں؟ کس کے ساتھ کھیلوں؟ بوڑھے چچا تم کیا جانو —— تم کیا جانو؟"

شمشیر سب کچھ جانتا تھا۔ وہ ہر ہفتے دلیر کے خط کا جھوٹ تراشتا "آج پھر خط آیا ہے" وہ کہتا "لکھتا ہے، شاداں سے کہیے میرے لیے دعا کیا کرے، اداس نہ رہے۔ گرج کڑک اور دھواں دھار طوفانوں کے بعد مطلع صاف بھی ہو جاتا ہے۔ سورج بھی چمکتا ہے۔ ہری بھری گھاس بھی اگتی ہے ——" شاداں کو کبھی کبھی شک گزرتا کہ چچا جھوٹ بول رہا ہے آخر اس نے چھ مہینے تو دلیر کے ساتھ گزارے تھے، اور وہ جانتی تھی کہ دلیر مڈل پاس سہی پر اسے ایسی باتیں قطعی نہیں آتیں۔ اسے تو ماہیے، ڈھولے، ٹپے اور دوہے کے سوا

اور کچھ معلوم نہیں۔ یہ تو بڑی دانائی کی باتیں ہیں۔

ادھر شمشیر کے ذہن میں شمشیر اور دلیر کے وزن پر کئی نام گھومنے لگے تھے۔ مگر ان سب میں شیر خاں اسے ایسا بھایا کہ وقت سے پہلے ہی گاؤں بھر میں اعلان کر دیا۔

"اور اگر لڑکی ہوئی؟" کسی نے پوچھا۔

"تو شیرنی۔" شمشیر نے جواب دیا۔

"میں کہتا ہوں اگر نہ لڑکا ہوا نہ لڑکی تو؟" دادا شہباز پنشنر کے پوپلے منہ پر گول مول مسکراہٹ ناچنے لگی۔

"عورتیں لڑکا لڑکی کے سوا اور بھی کچھ جنتی ہیں کیا؟"

"ہاں! ہاں۔"

"کیا؟"

"یہی لنگور، گیدڑ، بندر۔"

لوگ سنجیدہ ہو گئے کیونکہ موضوع عام نہیں تھا بلکہ خاص شاداں سے متعلق تھا، اور شہباز حسب عادت زیادتی پر اتر آیا تھا۔ مگر شمشیر نے کہا "کبھی چچا، مذاق کا کوئی رنگ روپ بھی تو ہونا چاہیئے۔ یہ کیا کہ ڈھیلا کھینچ مارا اور کہا، ہم مذاق کر رہے تھے۔"

"منشی جی سے پوچھ لو۔" دادا شہباز ہار کب ماننا تھا۔ "امرت سر میں ایک عورت نے بندر جنا ہے۔ زندہ ہے، ہسپتال میں ہے، ماں کا دودھ پیتا ہے البتہ دم ذرا چھوٹی ہے ——"

دادا شہباز کا مذاق برداشت کی حد سے باہر ہو چلا تھا۔ مگر شمشیر کو وہ دن نہیں بھولے تھے جب اس نے دادا شہباز کی ایک موٹی تازی شرمیلی بہو کے پیٹ کو تھپتھپا کر کہا تھا "خضر کی عمر اور سکندر کا بخت پاؤ۔ اب آ بھی جاؤ نا۔"

اور جب بچہ پیدا ہوا تو وہ سچ مچ شیر ہی نکلا۔ بڑے بڑے ہاتھ پاؤں، موٹا سر، گول چہرہ، گورا رنگ ——" ہے دادا شہباز!" مارے خوشی کے اس کے گلے سے اکٹھی

آٹھ دس آوازیں نکل گئیں " سنتے ہو! شیر پیدا ہوا ہے شیر"

"تچ تچ تچ " دادا شہباز نے ہمدردی کی " ہائے ہائے انسان کے گھر میں حیوان تیرے کھیل نیارے ہیں رے مولا۔ لڑکی ہی ہوتی پر یہ شیر، یہ دم والا شیر، شمشیر! میں تمھارے کسی کام آسکتا ہوں ؟"

بوڑھے کو بازو سے پکڑ کر گھرلے آیا۔ ننھا دکھایا اور پھر اس کے منہ میں مصری کی ڈلی ٹھونس کر بولا " سیدھی طرح مبارک دے ورنہ دوسری ڈلی سے باچھیں چیر ڈالوں گا"

شہباز چوکنے والا کب تھا۔ مصری کو ایک طرف کے جبڑے میں سنبھال کر بولا " ہم سولہ سترہ روپے کے بدلے فرانس کے میدانوں میں جانیں دینے جا نکلے تھے۔ مصری کی ڈلی کے بدلے باچھیں چیری گئیں تو وارے نیارے ہیں ہمارے، جا نہیں دیتے مبارک ـــ"

اور پھر سنجیدہ ہو کر اس نے شمشیر پر مبارکبادوں کی بوچھاڑ کر دی۔

دلیر ابھی جھانسی ہی میں تھا کہ اسے باپ بن جانے کی اطلاع ملی۔ فوراً ریشمی کپڑوں کی ایک گٹھری پارسل بھجوا دی۔ ادھر شاداں کو ہنسنے کھیلنے کا بہانہ ہاتھ آگیا۔ ادھر شمشیر کے چہرے کی جھریاں مسرت کی لہروں میں بدلنے لگیں اور اس کی حس مزاح تیز ہونے لگی۔

اب اسے ہر مہینے بیٹے کی طرف سے بیس روپے مل جاتے تھے اور وہ ہر روز مہاجن کی دوکان کے سامنے سے گزرتے ہوئے کہتا تھا " بس ایک سال چاچا، ایک ایک کوڑی چکا دوں گا، پر دیکھو، وہ جو تم پچاس کے پانچ سو اور ہزار کے دس ہزار بنا لیتے ہو نا؟ وہ جادو کا کھیل مجھے نہ دکھانا۔ میں مداریوں سے نفرت کرتا ہوں "

مہاجن ہنستا۔ یہ ہنسی پہلے تو اس کی چندھی آنکھوں میں جھکتی، پھر گالوں کے انبار میں ہونٹوں کا شگاف پیدا ہوتا اور پیٹ نیم بسمل مرغے کی طرح تڑپنے لگتا، پیٹ کے کافی دیر تک تڑپنے کے بعد اس کے حلق میں گڑگڑاہٹ پیدا ہوتی، سانسوں میں کشتیاں ہوتیں اور قہقہہ، کھانسی، چھینک اور چیخ کا ایک مرکب بن کر اس کے نتھنوں اور ہونٹوں سے ایک دھماکے کی طرح ابل پڑتا اور پھر ایک زہرہ گداز ڈکار کے بعد مہاجن کہتا " بڑے پاپی ہو تم "

شمشیر خاں اکثر کہا کرتا تھا کہ مہاجن کا قہقہہ سب سے پہلے اس کے معدے میں بیدار ہوتا ہے۔ چربی کی ایک تہہ سے سر نکال کر اِدھر اُدھر دیکھتا ہے، ابھرتا ہے، مگر جب ٹھوڑی تک پہنچتا ہے تو بھٹک جاتا ہے۔ ایک حصّہ نتھنوں اور دوسرا منہ کے راستے باہر نکلتا ہے تیسرا حصّہ ٹھوڑی کی گدگدی آرام گاہ میں لیٹ رہتا ہے، اور جب مہاجن ہنس چکتا ہے تو یہ بقیہ حصّہ ڈکار بن جاتا ہے۔

بہت کم لوگ جانتے تھے کہ مہاجن کے قہقہے کی طرح اس کی زندگی کا ہر پہلو اور اس کی ہر حرکت ایک طویل عمل کی عادی بن چکی تھی۔ لال لانبی پوتھیوں کے ٹاکروں میں سیاہ روشنی کی ننھی ننھی بندیاں کئی گھروندوں کی تباہی کی ضامن تھیں، اور ہر رات کڑوے تیل کی روشنی میں ان بندیوں میں اضافہ ہی ہوتا رہتا تھا اور پھر وہ نہایت سبک سے چاقو کی کھرچنی اور گھسا ہوا موم اور "ہرے رام ہرے رام"۔

ایک روز شمشیر کو دلیر کا خط ملا۔ اگرچہ وہ ننھے شیر خاں کو دیکھنے کے لیے حد سے زیادہ بے تاب ہے۔ مگر سرکاری حکم کے مطابق وہ کسی نامعلوم مقام کو جانے کے لیے آج کل کراچی میں ہے۔ وہاں سے باقاعدہ خطوط لکھتا رہے گا۔ چند روز بعد شمشیر کو معلوم ہوا کہ دلیر سمندر پار جا چکا ہے اور اپنی تین چوتھائی تنخواہ اس کے نام لکھوا گیا ہے۔ شمشیر کا مقصد پورا ہو رہا تھا۔ لیکن وہ پٹواری سے ہٹلر کی فاتحانہ یلغاروں کے قصے ہر روز سنتا تھا اور ان لوگوں پر اسے بہت رحم آتا تھا جو اس گرجتی گونجتی اور بجلی کی سی تیزی سے بڑھتی ہوئی فوج کے مقابلہ پر ڈٹے ہوئے ہیں۔ "کچھ سنا شمشیر خاں" ایک روز پٹواری نے اسے ایک خبر سنائی "دس دن ہوئے میں نے تجھے بتایا تھا کہ جرمن دنیا کے سب سے خوبصورت شہر پیرس میں داخل ہو گئے۔ اب آج کی خبر ہے کہ فرانس نے جرمنی کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے"۔

"دس دن میں سارے ملک فرانس پر قبضہ"۔ شمشیر بولا۔ "حلوے کی طرح نگل گیا کمبخت"۔

"فرانس ہے بھی حلوہ" دادا شہبانہ چہکا۔ "میٹھا میٹھا، تر و تازہ، ارنگ برنگا"۔

اچانک شمشیر سیدھا بیٹھ گیا۔ "یہ فرانس کہیں دور ہے نا منشی جی؟ کراچی سے کوئی جہاز اگر ۱۱ رجون کو چلے تو ۲۲ رجون تک فرانس پہنچ سکتا ہے کیا؟"

اسے تسلّی دی گئی کہ دلیر ابھی فرانس نہیں پہنچ سکا ہوگا۔ مگر اب ہر روز پٹواری اسے ایک وحشت ناک خبر سناتا اور اس کے چہرے پر جھریاں پھر سے ابھرنے لگتیں۔ انگلستان پر ہر روز تڑا تڑ حملے ہو رہے ہیں، مکان جل رہے ہیں، عمارتیں گر رہی ہیں۔ ملبے کے نیچے سے عورتوں، بوڑھوں اور بچوں کی لاشیں اور خون کے چھینٹے، انگریزوں کے خون کے چھینٹے، ہمارے حاکم کے خون کے چھینٹے۔

"بھئی سمجھ میں نہیں آتی یہ بات۔" ایک سادہ دہقان نے حقہ کے لیے تمباکو مسلتے ہوئے کہا۔ "انگریز بھی مرتے ہیں کیا؟"

شمشیر کو جی بہلاوے کے لیے ایک موضوع ہاتھ آگیا۔ "نہیں، نہیں میرے عزیز، انگریز کہاں مرتا ہے۔ انگریز تو قطب صاحب کی لاٹھ ہے۔ ساگوان کا شہتیر ہے، فولاد کا ڈھانچہ ہے۔ میرے بھائی! انگریز بھی تو ہم جیسا انسان ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ گورا ہے اور ہم ذرا سانولے ہیں۔ اس کے پاس جہاز ہیں، ہمارے پاس اونٹ۔ اس کے پاس بندوقیں ہیں ہمارے پاس لاٹھیاں۔ اس کے پاس کپڑے کی مشینیں ہیں اور ہمارے پاس بوستان جولاہے کی کھڈّی جس میں اس کا ننھا بچہ گر کر اللہ میاں کے ہاں سدھار گیا تھا بے چارہ۔ اور پھر انگریز کے پاس چرچل ہے اور ہمارے پاس دادا شہبازا، جو آرے کا ڈھلانی موڑ کاٹتا ہے تو ایک قدم پر پندرہ بار کھانستا ہے اور جس کی بیگھہ بھر زمین میں سے سرکاری سڑک گزرنے والی ہے۔"

اور پھر پٹواری نے روز ایک تازہ پھڑکتی ہوئی خبر سنانا شروع کی۔ "آج گاندھی جی نے ہر انگریز سے اپیل کی ہے کہ وہ جرمنوں پر اپنا دروازہ کھلا چھوڑ دے اور ان سے کسی قسم کا لین دین نہ کرے۔ جرمن خود ہی تنگ آکر واپس جرمنی چلے جائیں گے۔"

"واہ رے میرے ملنگ سائیں، تیری دور بلائیں۔" شمشیر حاشیہ آرائی کرتا۔ "دشمن سے ایک چھنگی تک نہ لو تو پھر دشمنی کا ہے کی! دروازہ کیوں کھلا چھوڑ دو، لٹھ کیوں نہ

جاؤ تالو پر کہ بھر کس نکل جائے۔ ہائے کتنا جی چاہتا ہے کہ گاندھی جی چرخے کی تکلی پر سوت کاتنے کی جگہ اس سے کسی دشمن کی آنکھ نکال لیتے۔"

"دنیا کہاں سے کہاں نکل گئی۔" دادا شہباز نے کہا۔ "اور ادھر سے حکم ملت ہے، کھڈیاں بناؤ۔"

بات معقول تھی، مگر وہ شمشیر ہی کیا جو دادا شہباز کی بات نہ ٹوکے۔ "تم نے یہ بال کڑکتی دھوپ میں سفید کیے ہیں دادا۔ ہو سکتا ہے کھڈیوں کے بہانے مورچے بنوائے جا رہے ہوں۔"

"اور یہ دروازے کھلے چھوڑ دو۔"

"یعنی اندر آتے ہی دبوچ لو۔"

"اور یہ چرخہ چلاؤ؟"

"یعنی چرخہ چلاتے ہوئے کسی سے چل جائے تو تکلی چبھو دو، ہتھی دے مارو کلّے پر۔"

"لٹھ کیوں نہ دے مارو کھوپڑی پر؟"

"اس طرح دشمن خفا ہو جاتا ہے نا بھولے دادا ——— ہاں تو منشی جی کوئی اور خبر؟"

"انگلستان نے فرانس کے بیڑے پر قبضہ کر لیا ہے، زبردستی۔"

"یعنی گاندھی جی کی نصیحت نہیں مانی؟"

چوپال پر گپوں اور قہقہوں کے ہجوم میں وہ بہت حد تک پرانے شمشیر کے روپ میں اجاگر ہو جاتا۔ مگر گھر لوٹتے ہی اس کا ضمیر اس کے چٹکیاں لیتا۔ دلیر کو جنگ پر بھیجنے کا مقصد اس کے سامنے آتا تو وہ اپنے آپ کو نہایت کمینہ، ذلیل اور خود غرض محسوس کرتا۔ پریشان ہو کر اندھیرے میں آوارہ پھرتا رہتا اور جب کہیں چین میسر نہ آتا تو صندوق کھول کر دلیر کا بھیجا ہوا روپیہ گننے لگتا۔

انھیں دنوں دلیر کا خط آیا کہ وہ اب مصر میں ہے اور خوب مزے میں ہے اور مصری اذان بڑی سریلی ہوتی ہے اور مصری لوگ بڑے اچھے ہوتے ہیں اور ہم روز

تماشے دیکھتے ہیں، سیر کرتے ہیں، اور ——" یعنی جنگ کا ذکر تک نہ تھا۔ شاداں نے یہ سنا تو شیر کو اچھالتی ہوئی آنگن میں بھاگ گئی، اور شمشیر خط کو دوبارہ اور سہ بارہ پڑھوانے کے لیے پٹوار خانے کے چکر کاٹنے لگا۔

"اٹلی نے سمالی لینڈ پر حملہ کر دیا۔" ایک دن پٹواری نے خبر سنائی۔ "سمالی لینڈ مصر کے قریب ہی ہے۔"

"ارے۔"

"ایک ہزار جرمن ہوائی جہازوں نے انگلستان پر حملہ کیا۔"

"خدا کی پناہ۔ یعنی ٹڈی دل ہوائی جہازوں کا!"

"اٹلی نے مصر پر حملہ کر دیا۔"

"————"

گاؤں والوں کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ انھوں نے شمشیر کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔ وہ چپ چاپ چوپال پر سے اٹھ کر چل دیا۔ اپنے کمرے میں آکر اس نے صندوق کھولا اور دلیر کی کمائی کو فرش پر بکھیر کر بچوں کی طرح رونے لگا۔ وہاں سے اٹھ کر دھم سے پلنگ میں گر پڑا۔ شاداں بھاگی آئی تو شمشیر بولا۔ "نہ جانے اب تک کیا کچھ ہو چکا ہوگا۔ دعا کر بیٹی، دعاؤں کا تانتا باندھ دے۔ اتنی دعائیں مانگ کہ اللہ میاں کے دربار میں شور مچ جائے۔ رو رو کر، بلک بلک کر، سسک سسک کر دعائیں مانگ۔ دلیر کی زندگی کے لئے دعائیں مانگ، اور مجھ پر لعنتیں بھیج کہ میں نے قرض اتارنے کی لالچ میں اپنے اکلوتے لعل کو آگ کی بھٹی میں جھونک دیا۔ یہ نہ سوچا کہ میں اجڑ جاؤں گا۔ یہ نہ سوچا کہ شاداں میری اچھی بیٹی کا سہاگ ابھی نیا نویلا ہے۔ یہ نہ سوچا کہ ——" اس کا گلا رندھ گیا اور سر کو تکیے پر رکھ کر رونے لگا۔

شاداں مچل گئی۔ شیر کو فرش پر بٹھا کر شمشیر کی پیٹھ پر دونوں ہاتھ رکھ کر بولی۔ "میرے چچا کچھ بتاؤ تو سہی، آخر کیا ہوا؟ کچھ تو کہو۔"

شمشیر نے بازو سے اپنی آنکھوں کو چھپا کر کہا۔ "دلیر مصر میں ہے اور مصر پر اٹلی نے

حملہ کر دیا ہے۔ اب وہاں جہاز بم برسا رہے ہوں گے۔ توپیں چل رہی ہوں گی۔ بندوقوں کی تڑ تڑ اور گرد و غبار اور دھواں اور دھائیں دھائیں —— میرا نازوں سے پالا دلیر۔ میری حرص کا شکار دلیر، میرے دلیر میرے ——" وہ پھر رونے لگا۔

چھ مہینے تک شمشیر اور شاداں کے آنسو خشک نہ ہوئے اور دعائیں بند نہ ہوئیں، مزاروں پر دیے جلے۔ بھکاریوں میں گڑ بانٹا گیا۔ بکرے قربان ہوئے۔ دونوں ایسے حواس باختہ ہو گئے کہ رات کو گھر میں دیا تک نہ جلتا اور اگر جلتا تو جلتا ہی رہتا۔ کپڑے میل سے اٹ جاتے تو یونہی رسماً تھوپ تھاپ کر الگنی پر ڈال دیئے جاتے۔ شیر بیمار پڑتا تو کسی آتی جاتی بڑھیا سے دوا پوچھ لی جاتی۔ چوپال پر پٹواری سے لوگ نئی خبروں کا تقاضا کرتے تو وہ کہتا "بھئی نئی خبریں تو بہت ہیں پر اگر چچا شمشیر نہ ہو تو بات کا سارا مزہ کرکرا ہو جاتا ہے، اسے آنے دو ——" مگر شمشیر کو اب چوپال پر بیٹھ کر گپیں ہانکنے کی فرصت ہی کہاں تھی۔ وہ نوجوان تک اداس ہو گئے تھے، جن پر نہایت کڑی مگر شگفتہ تنقید کرکے وہ قہقہوں کا طوفان مچا دیتا تھا۔

چھ مہینے کے بعد اسے دلیر کا خط ملا کہ لڑائی میں اس کے کندھے پر معمولی سے زخم آئے تھے، اور اب وہ تندرست ہو کر عنقریب "انڈیا" آنے والا ہے۔

"انڈیا؟" اس نے پٹواری سے پوچھا۔

"ہاں۔ یعنی ہندوستان۔"

"یہ انگریزی ہے؟"

"ہاں۔"

"یعنی دلیر اب انگریزی بھی جانتا ہے؟"

"یہی معلوم ہوتا ہے۔"

"اری شاداں بیٹی!" وہ گھر آ کر پکارا "کچھ سنا؟" دلیر انگریزی بھی بولنے لگا، اور اب واپس آ رہا ہے، اور دیکھ وہ مرغی پھر رہی ہے نا۔ وہ گوری سی بانجھ کمبخت، جو بڑے نخروں کے ساتھ تین مہینے کے بعد ایک ذرا سا انڈا برآمد کرتی ہے، اسے ذبح کرا لے اور ساتھ گورکھ کی دوکان سے جوشی چاول لے آ، اور دیکھ بڑے مٹکے میں جو گڑ پڑا

ہے نا۔ وہ بچوں میں بانٹ دے ——— ہاں ——" باہر گلی میں آکر وہ خوامخواہ ایک نوجوان کے پیچھے پڑ گیا "ارے طرے باز! ارے بائیں مڑتے ہوئے دائیں دیکھنے والے، بات سُن، پگڑی کو اتنی کلف نہیں لگانی چاہیے کہ اچھی خاصی ملائم ململ ٹین کا پترہ بن کر رہ جائے"
شمشیر پھر چوپال کی رونق بن گیا "جنگ کی کوئی نئی خبر؟" اس نے پٹواری کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا "کوئی تروتازہ خبر ہو بھئی۔ ننھے ننھے گاؤں اور چھوٹی موٹی کھاڑیاں اور تل بھر کے جزیرے۔ نہ نہ، بہت ہو چکیں یہ باتیں۔ کوئی ایسی خبر سناؤ منشی جی کہ اوسانوں کو ٹھکانہ ملے"

دادا شہباز ایک بڈھے سے کسی بلغم توڑ نسخے کے اجزا پوچھ رہا تھا، یکایک چونکا اور کھسک کر شمشیر کے سامنے آ گیا "کیا کہا میاں شمشیر؟ ہائے ہائے، انسان بھی کتنا طوطا چشم ہے قرآن کی قسم ——— ارے تمھارا دلیر مصر میں تھا تو تم وہاں کے ہر ٹیلے کی خبر سنتے تھے اور اب تمھارا دلیر مصر سے واپس آ رہا ہے تو تم ننھے منے گاؤں اور چھوٹی موٹی کھاڑیوں کا ذکر ہی نہیں سنو گے؟ کوئی بہت بڑی خبر سنو گے تم؟ تو بھئی جنگ کی بہت بڑی خبر تو وہی ہوتی ہے جس میں اَن گنت انسان کھیت رہیں، اور میاں شمشیر جو جوان تمھیں بہت بڑی خبر سنانے کے لیے جانیں دیں گے، ان کے بھی تو باپ ہوں گے، ان کی بھی تو نئی نویلی بیویاں ہونگی، اور معصوم بچے اور پیارے دوست اور ہمدرد رشتہ دار۔ ان کی امیدیں اور ان کے حوصلے چاہے وہ جرمن ہوں چاہے انگریز چاہے ہندوستانی، میں انسانوں کی بات کر رہا ہوں"
شمشیر کا چہرہ ایک خوفناک ندامت آمیز سنجیدگی کے ہالے میں گھر گیا۔ مٹی ہوئی جھریاں پھر سے ابھر آئیں۔ پہلو بدلا اور سر پر ہاتھ پھیر کر شہباز کی طرف دیکھا "تم ٹھیک کہتے ہو چچا ——" اس کی آواز کھوکھلی تھی، اور بج رہی تھی اور اس میں گھبراہٹ کے اتار چڑھاؤ تھے "میں نے تو ویسے ہی بات کی تھی کہ ——— بات یہ ہے دادا کہ تم ٹھیک کہتے ہو"
"میں نے غلط بات کب کہی ہے؟" شہباز الجھ رہا تھا۔
"صرف اب" شمشیر موضوع کو بدلنا چاہتا تھا۔

لوگ ہنس پڑے۔

"میرا مطلب ہے میں نے کبھی نہیں کہی۔"

"سچ بات" شمشیر نے دادا شہباز کا فقرہ پورا کر دیا اور چوپال قہقہوں سے گونج اٹھا۔

مگر شہباز اپنے احساسات کی تلخی سے پیچھا نہیں چھڑا سکا تھا۔ بولا "تم مجھ سے بہت چھوٹے ہو شمشیر اور تم نے مجھ سے بہت کم دنیا دیکھی ہے۔ پچھلی لام کو ان آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں۔ سینکڑوں جرمنوں کو موت کے گھاٹ اتارا، اور سچ کہتا ہوں دشمن کی ہر لاش سے میرے دل کا ایک ٹکڑا چپک کر رہ گیا۔ اندھیری، گرجتی، دہاڑتی راتوں میں مردہ جسموں سے ٹھوکریں کھائیں اور ٹھوکر کھا کر گرا بھی تو لاشوں پر۔ کسی کی انتڑیاں باہر پڑی ہیں، کسی کا بھیجا چٹان پر بکھر گیا ہے۔ کسی کی ٹانگیں غائب ہیں۔ کوئی مرنا چاہتا ہے اور مر نہیں سکتا، کوئی جینا چاہتا ہے مگر جی نہیں سکتا۔ میں نے ایک روز ایک لاش دیکھی، جرمن سپاہی تھا۔ اتنا خوبصورت کہ موت چھاپ لینے کو جی چاہے۔ میں نے اس کی جیبیں ٹٹولیں تو اندر سے سنہری بالوں کا ایک گچھا نکلا اور کسی پھول کی چند سوکھی پتیاں اور مڑی تڑی تصویر —— ایک لڑکی کی —— جس کی آنکھیں اتنی گمبھیر تھیں قرآن کی قسم کہ جہان ڈوب جائے، اور اس کی آنکھیں جیسے پوچھ رہی تھیں "سچ مچ کیا تم واپس نہیں آؤ گے؟" میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے یہ تینوں چیزیں اس کی جیب میں ڈال دیں۔ اس کے چہرے کو دیکھتا رہا اور میاں شمشیر، میری بات سننا۔ میں سچ کہتا ہوں، میں چیخ کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس کے منہ سے اچانک چند مکھیاں نکلیں، اور اس کے نیلے ہونٹوں اور ننھی ننھی سنہری مونچھوں پر بیٹھ کر پر سنوارنے لگیں —— یہ نوجوان بھی تو دنیا کو بہت بڑی خبر سنانے کے لیے مرا —— اور میں نے ان تمام خونوں کے بدلے سات روپے پنشن پائی —— یہ سات ٹھیکریاں —— یہ سات لعنتیں ——" دادا شہباز کی آواز تھرا گئی اور وہ لاٹھی سنبھالتا چوپال پر سے اتر گیا۔

"دادا!" شمشیر نے اسے پکارا۔

وہ بغیر مڑے بولا "میں پاگل ہو جاؤں گا، مجھے جانے دو۔"

"دادا" شمشیر ننھے بچے کی طرح پکارا اور پھر سر جھکا کر بیٹھ رہا۔ ایک مجرم کی طرح شرمندہ اور نڈھال ــــ جیسے دنیا کی ساری جنگوں کا ذمہ دار صرف وہی ہو۔

صبح کو اٹھا تو شاداں کے چہرے پر غیر معمولی تازگی دیکھ کر اس کا احساسِ مسرت پھر سے جاگ اٹھا، اور جرمن سپاہیوں کی لاشیں ایک طرف سرک گئیں۔ "دلیر آرہا ہے ــــ دلیر مصر سے بخیریت واپس آرہا ہے ــــ" اس کی ذاتی تسلی کے لیے یہی خیال کافی تھا اور دادا شہباز کی گھرّائی ہوئی آواز اور ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں ــــ "اور میں پاگل ہو جاؤں گا ــــ" بڑھاپا کتنا ذکی الحس ہوتا ہے اس نے سوچا۔

بڑھاپا کتنا ذکی الحس ہوتا ہے۔ اس نے ایک مرتبہ پھر سوچا۔ یعنی دلیر آرہا ہے تو اگر واپس بھی تو جائے گا اور واپس لاہور یا دلی تو نہیں جائے گا۔ جنگ پر ہی جائے گا، اور جنگ سے انسان ایک مرتبہ بچ نکلے تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہمیشہ بچتا چلا جائے۔

"دادا شہباز! قتلے کر ڈالوں تیری زہریلی زبان کے ــــ بات کیا تھی اور تونے کہاں پہنچا دی۔"

اس نے بہت کوشش کی کہ مسکرائے، قہقہے لگائے، پھبتیاں کسے۔ مگر اس کے ذہن پر اچانک ایک خوبصورت چہرہ ابھرتا، اور پھر نیلے ہونٹوں اور سنہری مونچھوں پر مکھیاں بھنبھناتیں اور کلیجے میں کرچ سے سنگینیں پیوست ہو جاتیں اور انتڑیاں باہر ابل پڑتیں۔

وہ شاداں سے کہتا۔ "بیٹی کوئی بات سناؤ ــــ" مگر وہ مسکرا کر پیاز کاٹنے لگتی۔

"ارے بھئی کوئی بات سناؤ" وہ گلی کے نکڑ پر بیٹھے ہوئے لوگوں سے کہتا۔

"دلیر کب آئے گا؟" سوال کا جواب سوال ہی میں ملتا۔

"دادا کوئی بات سناؤ" اس نے چرکے لگانے والے شہباز سے مرہم کی التجا کی۔

"بات؟" بڈھے نے پوچھا "یعنی کوئی بہت بڑی خبر؟"

اور شمشیر کے جی میں آئی کہ ہڈیوں کے اس ڈھانچے کو توڑ مروڑ کر ببول میں پھینک آئے۔

چند روز بعد اسے دلیر کا خط ملا کہ وہ گھر نہیں آئے گا۔ کراچی میں اترتے ہی اس کی رجمنٹ رنگون چلی گئی ہے اور رنگون سے سنگاپور جانے کا قصد ہے۔

"دلیر نہیں آرہا" ایک دھماکے کی طرح یہ الفاظ اس کے لبوں سے نکلے اور شاداں جو مسالہ رگڑ رہی تھی دم بخود ہو کر دیوار سے لگ کر بیٹھ گئی۔

"دلیر نہیں آرہا، وہ رنگون جا رہا ہے" اس نے دادا شہباز کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے چوپال پر اعلان کیا۔

"بہت بڑی خبر ہے بھئی" دادا شہباز کی لَے ابھی نہیں ٹوٹی تھی۔

شمشیر بگڑ گیا "دیکھو دادا! بہت لحاظ کیا تمھارا، تم چند دنوں سے ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گئے ہو، یہ اچھی بات نہیں۔ میں تمھارے سفید بالوں کی عزت کرتا ہوں ورنہ ——"

اور وہ غصے سے کانپتا ہوا چوپال پر سے اٹھ آیا۔

پٹواری نے آواز دی "جنگ میں یونہی ہوتا ہے چچا"

اور شمشیر نے پلٹ کر پٹواری کی طرف یوں دیکھا جیسے بس چلے تو اس کی کھوپڑی ادھیڑ کر رکھ دے۔

لیکن اسی روز ایک شہباز یا پٹواری کیا، وہ سارے گاؤں سے بگڑ گیا۔ شاداں تک کو جھڑک دیا "لوہے کی زبان ہوتی تو شاید مرچیں اثر نہ کرتیں، مگر اب تو گلے سے ناف تک جلتا ہوا فتیلہ رکھ دیا ہے تمھارے سالن نے —— بڈھوں کو جان سے مارنے کے اور بھی تو طریقے ہیں، کفگیر جما دو کنپٹی پر۔ کڑاہی دے مارو ماتھے پر —— لے جاؤ نہیں کھاؤں گا"

مگر آہستہ آہستہ وہ سنبھلتا گیا، اس کا بیٹا رنگون میں تھا اور اس کے خیال میں یہ ناممکن تھا کہ جنگ مغرب سے ہٹ کر ہزاروں میل کی الٹی زقند بھرے اور مشرق کے مرغزاروں میں ناچنے لگے۔ "مشرق میں کیا پڑا ہے" پٹواری نے کہا تھا "مشرق کے لیے دوسرے بم اور توپیں تھوڑی ہیں کہ اب یہ تکلف بھی کیا جائے"

"ایک جاپان ہے" دادا شہباز نے جہاں دیدہ سیاست دان کے انداز میں کہا

تھا" سو گنجی نہائے گی کیا نچوڑے گی کیا۔ برسوں سے سرپٹخ رہا ہے پر یہ افیمی ابھی تک اس کے مقابلے میں ڈٹے ہوئے ہیں اور بھئی جاپانی مال تو تم جانتے ہی ہو۔ جاپانی کھلونے ادھر بچے کے ہاتھ میں آئے ادھر دانت نکال بیٹھے۔ اور جاپانی ریشم کے کپڑے، ایک تاگا لٹک آئے تو سمجھو سارا تانا بانا اشارے کا منتظر ہے۔ ان کے جہاز بھی تو ٹین کے بنے ہوتے ہیں اور ان کے سپاہی ٹھنگنے، ناٹے، تم یوں جما کر ان کی کھوپڑی پر تھپڑ مارو تو زمین میں دھنس جائیں"

"نہیں نہیں" پٹواری نے دادا شہباز کو ٹوکا تھا "یہ بات تو نہیں دادا۔ مگر جنگ ابھی ادھر نہیں آئے گی۔ جنگ زندہ لوگ لڑتے ہیں۔ لاشوں نے بھی کبھی لڑائیاں کی ہیں بھولے بادشاہو"

ادھر دلیر کے خط پر خط آرہے تھے۔ رنگون کے پگوڈے، برما کے جنگل، ناریل اور کیلے اور ــــــ "ہم بڑے مزے میں ہیں۔ رنگون برما کی جنت ہے۔ جنگ نہ ہوتی تو میں شاداں، شیر اور آپ کو یہاں بلا لیتا"

شمشیر پٹواری کے پاس دوڑ آیا "کیا رنگون میں بھی جنگ ہو رہی ہے منشی جی؟"

پٹواری نے کان پر قلم دھر کر کہا "یہ جنگ کہاں نہیں ہو رہی ہے بچہ۔ جنگ صرف توپ، بندوق کی تو محتاج نہیں۔ بھوک بھی تو جنگ ہوتی ہے، غلامی کی بھی جنگ ہوتی ہے۔ انتظار کی بھی جنگ ہوتی ہے۔ جنگ ہر جگہ ہو رہی ہے، رنگون میں بھی ہو رہی ہے، ہمارے گاؤں بھی ہو رہی ہے۔ یہ ازلی و ابدی جنگ ہے، یہ جنگ جو کبھی ختم نہ ہو گی۔ یہ جنگ جو دریا سے نہریں نکالتی ہے، جو سرسبز کھیتوں میں سے سڑکیں گزارتی ہے، جو پانی پر لگان لگاتی ہے، جو پولیس کے سپاہی کو نمرود کے اختیارات بخشتی ہے، جو غریبوں کے کھدر میں جوئیں ڈالتی ہے، جو امیروں کے ریشم تلے گھٹیا کی صورت میں پروان چڑھتی ہے۔ تم ہر روز جنگ جنگ پکارتے ہو۔ جنگ ہر جگہ جاری ہے، ہماری زندگی خود ایک جنگ ہے"

"مگر جنگیں ختم بھی تو ہوتی ہیں"

"نہیں! کئی ایسی جنگیں بھی ہیں جو قیامت تک جاری رہیں گی۔ اب یہ جنگ ختم

ہو گی تو ایک نئی جنگ آدھمکے گی۔ وہ امن کی جنگ ہو گی۔ امن قائم کرنے کے لیے تجارت کی جنگ ہو گی۔ تجارت بڑھانے کے لیے سمندری راستوں کی جنگ ہو گی۔ ان کے عقب میں انسان کے پیدائشی حقوق کی جنگ ہو گی، اور جب یہ جنگ ہو گی —— یہ جنگ ہو گی ——" اور پٹواری نے کان پر سے قلم اٹھا کر ادھر اُدھر دیکھا اور بولا "کھونٹی کہاں گئی؟"

چند روز کے بعد اس نے پٹواری سے خبر سنی "جاپان نے امریکہ پر حملہ کر دیا" اور پھر اتنے ہی روز بعد اسے معلوم ہوا کہ جاپان نے سنگاپور لے لیا۔

مگر دلیر تو رنگون میں تھا اور رنگون سنگاپور سے بہت دور ہے۔ گھبرا کر اس نے شیر کو اٹھایا اور صحن میں ٹہلنے لگا "تیرا ابا رنگون میں ہے اور جنگ ہو رہی ہے سنگاپور میں اور سنگاپور بہت دور ہے رنگون سے" بچّے نے ناک پر ہاتھ رگڑ کر دادا کے بال پکڑ لیے اور جب بڑی مشکل سے اس نے بچّے کی گرفت ڈھیلی کی تو بچہ رونے لگا۔ شاداں بھاگی آئی۔ وہ رو رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے ڈوروں میں خون تھا۔ اُس وقت سورج غروب ہو رہا تھا۔ شمشیر نے محسوس کیا کہ ساری کائنات پر انسانی خون کے چھینٹے بکھر گئے ہیں۔ لاشیں پہیوں تلے چیخ رہی ہیں۔ کھوپڑیاں فضا میں اڑتی پھر رہی ہیں۔ کسی آسیبی ہاتھ نے افق پر سے لپک کر کھیتوں کی ہریاول کو نچوڑ لیا ہے اور ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے جس میں تازہ خون کی بو ہے۔ سڑتی ہوئی نعشوں کی بو ہے۔ جھلسے ہوئے چمڑے کی بو ہے۔

"دیا جلاؤ" وہ پکارا۔

کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد وہ بھڑک کر اٹھا اور صحن میں جا کر چنگھاڑا "شاداں میں بک رہا ہوں۔ دیا جلاؤ"

وہ اس وحشت ناک خاموشی کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ دانت بھینچ کر چلایا۔

"دیا جلاؤ شاداں مجھے اندھیرا نگل جائے گا"

دروازے پر کسی کی دستک ہوئی "کون ہے؟" وہ اسی شدّت سے پکارا اور

دروازے تک گیا جہاں مہاجن کی ٹھوڑی جھٹپٹے میں تھیلی کی طرح لٹک رہی تھی۔" اب کے تم نے قسط نہیں دی۔"

"نہیں دوں گا قسط۔" شمشیر نے کواڑ پر گھونسا جما کر کہا۔ "کب تک دیتا رہوں گا قسطیں۔ میں نے تمھاری قسطوں کے لیے اپنا بچہ موت کے منہ میں ڈال دیا۔ اپنے آنگن کی رونق لٹوا دی۔ اپنی روح کو نچوڑ کر تیری پیاس بجھانی چاہی پر تیری پیاس نہیں بجھے گی۔ تو نے میرے دلیر کو رڑکا۔ اب تو میرے شیر کو بھی چبائے گا —— جا نہیں دیتا قسطیں، بتا دے جا کر اپنے ہوتوں سوتوں کو —— نالش کر دے ——" پیچھے سے شاداں نے آکر اسے کھینچ لیا۔" آپ کس سے بول رہے ہیں سیٹھ تو چلا گیا؟"

"دیا کیوں نہیں جلایا تم نے؟"

"جلایا ہے۔"

"کہاں جلایا ہے؟ کدھر جلایا ہے؟ جلایا ہوتا تو ——" مگر دیا جل رہا تھا اور دیئے کی روشنی میں شاداں کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ خود شمشیر کا سارا وجود جل رہا تھا، وہ دھم سے بستر پر جا گرا۔ بہت دیر کے بعد کروٹ بدلی۔ اٹھ بیٹھا، سر کو دبایا اور ہولے سے بولا۔" شاداں بیٹی، ذرا ادھر آکر دیا بجھا دے، تیل ضایع ہو رہا ہے خوامخواہ۔"

دلیر کی خاموشی اور خطرناک ثابت ہوئی۔ قسم قسم کے وسوسے شمشیر کو پریشان کرنے لگے۔ شاداں گھلتے گھلتے کانٹا بن گئی۔ اس کا دودھ خشک ہو چلا تھا۔ پڑوس کے دھوبیوں سے وہ بکری کا دودھ خرید لاتی تھی۔ مگر شیر ہمک ہمک کر ماں کے سینے سے چمٹ جاتا۔ ادھر پٹواری نت نئی اور خطرناک خبریں سنانے لگا۔ دادا شہباز شمشیر کو بہلانے کے کئی جتن کرتا مگر شمشیر مری ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ ٹال جاتا۔ ہر روز مدرسے جاتا۔ جب ماسٹر جی ڈاک کھولتے تو وہ بت بنا ایک طرف کھڑا رہتا ——" تمھارا خط نہیں آیا چچا۔" ماسٹر جی کہتے اور وہ سر جھکائے گھر کو پلٹ آتا۔

ہر صبح کو مدرسے میں سارا گاؤں جمع ہوتا تھا۔ سب اپنے اپنے بیٹوں، بھتیجوں

نواسوں اور پوتوں کے خط لینے آتے اور دکھوں کی گٹھریاں اٹھا کر واپس جاتے اور پھر ایک دن اچانک ڈاک کے بھرے بھرے تھیلے میں سے سرکاری خطوط کا ایک ڈھیر سا برآمد ہوا۔ ایک خط شمشیر کے نام بھی تھا۔ اسے سرکار نے اطلاع دی تھی کہ دلیر جاپانیوں کا قیدی ہو چکا ہے۔

خط کھلتے جاتے تھے اور آنکھیں بھیگتی جاتی تھیں۔ اچانک ایک طرف بوڑھے نے چٹاخ سے اپنی گنجی کھوپڑی پر ہاتھ مار کر کہا: "میں اجڑ گیا ——" اور پھر ہر طرف سسکیاں اور فریادیں اور شیون —— ڈاک خانہ ماتم کدہ بن گیا۔ کوئی جنگ میں مارا گیا تھا۔ کسی کا کچھ پتہ ہی نہیں تھا۔ کوئی جاپانی قیدی تھا —— آن کی آن میں گاؤں کے بہت سے گھروں میں واویلا مچ گیا۔ چھاتیاں کوٹی جانے لگیں۔ بال نوچے جانے لگے۔ گلیوں میں بھگدڑ مچ گئی: "جنگ ہر جگہ ہے!" شمشیر کے کانوں میں پٹواری کے الفاظ گونج رہے تھے۔

"شاداں شاداں!" اور صحن کے کونے میں بیٹھی ہوئی شاداں نے سر اٹھایا، اس کی آنکھیں سوج رہی تھیں اور کھلے بال زمین کو چھو رہے تھے۔ "میں سن چکی ہوں!" اس نے بلکتے ہوئے کہا۔

"شیر کہاں ہے؟" شمشیر نے پوچھا۔

"پڑا ہوگا کہیں!" شاداں گھٹنوں میں سر دے کر رونے لگی۔

شیر اندر کمرے میں ایک کھٹولے کے نیچے لڑھکتا پھر رہا تھا۔ اس کے منہ میں مٹی تھی اور بالوں میں تنکے اٹک گئے تھے۔ شمشیر نے اسے اٹھایا، چوما، چوم چوم کر اسے نڈھال کر دیا۔ اور پھر اسے شاداں کے پاس بٹھا کر بولا: "یہ سب میرا کیا دھرا ہے۔ مجھ بوڑھے کا مجھ خناس کا۔ بیٹے کو یوں جنگ میں بھیجا جیسے جہاد کا حکم مل چکا ہے —— میں —— میں ——"

مگر اس نے اچانک محسوس کیا کہ یہ مقام اور یہ موقعہ ایسی باتوں کا نہیں۔ پلٹ کر اپنے پلنگ پر آیا۔ وہاں سے اٹھ کر مرحوم نوجوانوں کے والدین کے پاس جا نکلا۔ ایک گھر میں اسے پٹواری مل گیا۔ بولا۔

"بڑا افسوس ہوا چاچا!"

شمشیر نے بازو اٹھا کر انگلیوں کو ایسا جھٹکا سا دیا جیسے کہہ رہا ہے "قسمت!"

"تم جب اپنے کلیجوں کے ٹکڑوں کو جنگ کی بھٹی میں جھونک رہے تھے تو تمھیں یہ کسی نے نہ بتایا کہ ـــــ" اس وقت ذیلدار فاتحہ خوانی کے لئے آنکلا اور پٹواری دبک کر دیوار سے لگ گیا۔

جاپان کی فاتحانہ یلغار برق رفتاری سے بڑھ رہی تھی۔ ادھر جرمنی نے اتحادیوں کے چھکّے چھڑا دیئے تھے۔ مگر اب گاؤں والے بالکل بے حس تھے۔ جیسے جنگ کے ساتھ ان کی ساری دلچسپی اور وابستگی ان کے بیٹوں اور پوتوں کی وجہ سے تھی اور جب وہ کٹ مرے یا قیدی ہوگئے تو جنگ ختم ہوگئی۔ باہر چراگاہوں میں ریوڑ چرنے جاتے تو ان کے پیچھے بوڑھے بوڑھے گڈریے ہوتے۔ کھانستے اور ہانپتے ہوئے ـــــ کھیتوں کی رکھوالی کرنے والیاں اپنے بھائیوں اور خاوندوں کی یاد میں دھیمے سروں میں گاتیں اور روتیں، چوپال پر الاؤ کے ارد گرد دہقان چپ چاپ بیٹھے رہتے۔ گلیوں میں خاک اڑتی۔ ٹھنڈی کنواری صبحوں کو بوڑھیوں کی سسکیاں اور کھانسیاں داغ دار کر دیتیں۔ پھوٹتی ہوئی شفق کے کلیجے میں خرخراتے ہوئے گلے والے عمر رسیدہ مؤذن کی آواز برچھے کی طرح گھس جاتی۔ زندگی جیسے پاؤں گھسٹتی پھر رہی تھی۔ ماری ماری، خانماں برباد اور پریشان حال۔ گھومتی اور چکراتی ہوئی، اونچی لگروں پر رکتی اور گہری کھاڑیوں میں ٹھٹکتی ہوئی ـــــ لال گالوں اور چمکتی آنکھوں اور سریلے گیتوں کی تلاش میں ـــــ مگر لال گالوں کو گدھ نوچ کر لے گئے تھے۔ چمکتی آنکھیں مصر کے ریگستانوں میں اور برما کے جنگلوں میں بجھ چکی تھیں اور سریلے گلوں کا رس صحرائی مکھیوں نے چوس لیا تھا ـــــ اور جنگ جاری تھی ـــــ عوام کی جنگ ـــــ جمہوریت کی جنگ ـــــ نوع انسان کی آزادی کی جنگ ـــــ اور دریائے سندھ سے ایک بہت بڑی نہر نکالی جا رہی تھی اور دادا شہباز کی ایک بیگھہ زمین پر سے پکّی سڑک گزرنے والی تھی۔ اشیائے خوردنی نابود ہو رہی تھیں۔ ایک ہندوستانی نے ایک یوروپین نازنین کے بوسے کے عوض ہزاروں روپیہ کا چندہ جنگ میں دیا تھا، اور مہاجن شمشیر کے پیچھے سائے کی طرح لگ گیا تھا۔ "تھوڑی سی رقم ہی تو باقی ہے، چکا دو، مجھے نیا دھندا شروع

کرنا ہے" ــــــ "نیا دھندا!" ــــــ پٹواری نے کہا تھا۔ "یعنی اناج کے ذخیرے اور ریزگاری کی تھیلیاں اور ــــــ" ــــــ "نہیں نہیں" مہاجن نے ٹھوڑی کے بلوں میں سے میل کی مروڑیاں نکال کر کہا تھا۔ "میں کانگریسی ہوں میں ایسا نہیں کروں گا"

ہے شمشیر چچا ــــــ جیسے ہر گاؤں ڈالا پکار رہا تھا ــــــ ارے کچھ بولو، کوئی پھبتی، کوئی مذاق، کوئی لطیفہ ــــــ کچھ سناؤ کبھی ورنہ ہماری روحیں بجھ جائیں گی، ہمیں نوجوان بھائی اور بھتیجے اور پوتے راتوں کی خاموشیوں میں آ آکر ستاتے ہیں۔ لال لال آنکھیں نکال کر ہمیں اپنے پھٹے ہوئے پیٹ، کٹے ہوئے بازو اور کچی ہوئی رانیں دکھاتے ہیں اور کہتے ہیں "مبارک ہو، مبارک ہو، مبارک ہو" ــــــ ہے شمشیر چچا کوئی بات سناؤ۔ ہمارے کانوں میں ہمارے عزیزوں کی کراہیں برمے کی طرح گھسی جا رہی ہیں۔ ہماری بیوہ بہنیں، ہماری لٹی ہوئی بیٹیاں، ہمارے کچلے ہوئے بچے! ــــــ شمشیر چچا! ہے شمشیر چچا!

مگر شمشیر چچا پر تو کوئی اور دھن سوار تھی۔ وہ اب چپ چاپ رہنے لگا تھا۔ ہر روز ڈاک خانے میں جانا اس کا معمول ہو گیا تھا۔ وہاں سے ناکام لوٹ کر وہ پٹواری کے پاس چند لمحے گزارتا اور پٹواری کے زرد سوکھے ہوئے چہرے میں ٹھنسی ہوئی بڑی بڑی بے رونق آنکھیں چمچما اٹھتیں۔ "یہ جنگ کبھی ختم نہیں ہوگی۔ یہ جنگ کرۂ ارض کی آخری جنگ ہے۔ اس جنگ میں آدم کی اولاد جل بجھ کر بھسم ہو جائے گی، اور پھر اس راکھ سے ایک نئے آدم کی تعمیر ہوگی جس کی اولاد صحیح انسان ثابت ہوگی۔ وہ ایک گھر کی آبادی کے لیے بیس گھر نہیں اجاڑے گی۔ وہ ایک انسان کو موٹر مہیا کرنے کے لیے سینکڑوں انسانوں کی ٹانگیں نہیں کاٹے گی۔ ساری دنیا کی پیداوار ساری دنیا کے باشندوں کی ملکیت ہوگی۔ اس وقت چچا شمشیر ــــــ صرف ــــــ صرف اس وقت ــــــ صرف تبھی ــــــ" اور وہ کان پر سے قلم اٹھا کر کہتا۔ "کتھونی کہاں گئی؟"

مہاجن کی دکان کے سامنے سے گزرتا تو مہاجن لجاجت سے کہتا۔ "بھئی چکا دنا باقی حساب، اب نیا دھندا شروع کرنا ہے، اور پھر اب تو تمھارا بیٹا قیدی ہے۔ اس کی

ساری تنخواہ تمھارے نام آتی ہو گی۔"

اب تو تمھارا بیٹا قیدی ہے ـــــ اب تو تمھاری قسمت جاگ اٹھی ـــــ اب تو تمھاری برسوں کی تمنا پوری ہو ئی ـــــ اب تو تمھاری پانچو انگلیاں گھی میں ہیں! ـــــ لعنت ہو، شمشیر کو ہر کوئی چڑ کے لگاتا تھا۔ دادا شہباز بھی، جو کہتا تھا "آجائے گا، قیدیوں کو تو بادشاہیاں بڑے آرام سے رکھتی ہیں، دلیر ضرور آئے گا" ـــــ دادا شہباز اس سے مذاق کرتا تھا۔

آہستہ آہستہ گاؤں پر سکون چھاتا چلا گیا۔ مگر اس سکون میں زندگی کم تھی اور موت زیادہ۔ ہواؤں میں بیواؤں کی آہیں اور یتیموں کی کراہیں تھیں۔ کھیتوں کا رنگ زہر کی طرح کٹیلا تھا۔ مویشی تک اداس نظر آتے تھے۔ ہر جمعرات سے چوپال سے پرے گاؤں کے قبرستان میں بزرگوں کی قبروں پر چراغوں کی قطاریں جلنے لگیں۔ ہر ماں، ہر بیوی اور ہر بہن جمعرات کو مٹی کے دیوں میں تیل بھر کر بزرگوں کے پاس جاتی، ان کے سرہانے دیے رکھ کر دعائیں مانگتی ـــــ "میرا بیٹا واپس آئے، میرا مالک واپس آئے، میرا بھیا واپس آئے۔"

"کوئی واپس نہیں آئے گا۔" پٹواری نے کہا تھا۔ "میں کہتا ہوں، تم جن بھائیوں اور بیٹوں کو واپس بلا رہی ہو وہ کبھی واپس نہیں آئیں گے۔ وہ مر چکے ہیں یا مر رہے ہیں۔ ان کے ذہن مر چکے ہیں، ان کے عقیدے مر چکے ہیں۔ ان کے جسم شاید واپس آجائیں لیکن وہ اپنی روحوں کو وہیں دفن کر آئیں گے اور اس لیے جب وہ واپس آئیں گے تو تمھارے بھائی اور بیٹے نہیں ہوں گے۔ وہ دھرتی کے بیٹے ہوں گے اور جب میکسیکو میں کسی حبشی پر کوئی امریکن گولی چلائے گا تو درد کے مارے وہ چلا اٹھیں گے۔ جب شنگھائی میں کوئی جاپانی کسی چینی کے تھپڑ مارے گا تو وہ بلبلا اٹھیں گے۔ جب دلی میں کوئی گورا کسی ہندوستانی کے پیچھے پر لات جمائے گا تو وہ تڑپ اٹھیں گے اور پکار اٹھیں گے، اور ان کی پکار ہندوستان سے نکل کر لندن کے قلعوں سے ٹکرائے گی۔ واشنگٹن کے محلوں میں گونجے گی، ماسکو کے ـــــ"

"میرے خیال میں یہ پٹواری یا تو بم بنانے لگے گا یا قید ہو جائے گا۔" ذیلدار نے

ایک روز تنگ آکر کہا۔

پٹواری کی باتیں پرسکون تالاب کی سطح پر گرتے ہوئے ننھے ننھے سنگریزوں کی مانند تھیں۔ لہروں کے دائرے اپنے محیط وسیع کرتے ہوئے پھیلنے لگتے اور مٹ جاتے، اور پھر تالاب سو جاتا —— ایک سال گزر گیا۔ دو سال گزر گئے۔ کبھی کبھی یورپ کے محاذ سے کسی نوجوان کی موت کی خبر آتی تو اس تالاب میں چٹان سی گر پڑتی۔ تالاب تھلتھلا کر رہ جاتا۔ لہریں دیر تک اس کی سطح پر ناچتی رہتیں اور پھر سکون چھا جاتا —— سکون، جو ہر انجام کا آغاز ہے۔

ٹھیک ہی تو ہے۔ وہ بیوائیں جن کے پریشان بال، خشک ہونٹ اور چھلکتی ہوئی آنکھیں دیکھ کر کائنات بھی سسکیاں لینے لگتی تھی۔ وہ بہنیں جن کی چیخ پکار کا خلوص غیر فانی اور ابدی معلوم ہوتا تھا —— اب تینجنوں میں چرخے گھماتیں، چہلیں کرتیں، قہقہے لگاتیں، ٹھوکے مارتیں اور کہتیں۔ "تیری اوڑھنی کا رنگ تو بالکل نئے نئے خون کا سا ہے بہن نوری" "اور تیری لونگ، اتنی اچھی ناک پر اتنی بھونڈی لونگ، جیسے مصری کی ڈلی پر کوڑا اچک کر رہ جائے —— " ناکوں، آنکھوں، بالوں اور اوڑھنیوں کے گورکھ دھندے میں گھری ہوئی یہ بیویاں اور یہ بہنیں مصر کی ریتوں اور برما کی تپاوریں گلی ہوئی ہڈیوں کو فراموش کر چکی تھیں۔ صرف ماؤں کی محبت زندہ تھی۔ یہ ابدیت سے بھی گہری اور لامحدود محبت، جو انقلاب کا نام نہیں جانتی، جو خدا کی طرح اٹل ہے —— اندھیری شاموں میں جب یہ بوڑھی مائیں پلّو تلے دیئے چھپا کر بزرگوں کی قبروں پر جاتیں اور جب مقبروں پر سجے ہوئے دیئے، جو اب تعداد میں بہت کم رہ گئے تھے، ہوا کے جھونکوں میں اپنی آتشیں زبانیں تھرتھراتے اور قریب بیٹھی ہوئی ماؤں کے فق چہروں میں دھنسی ہوئی آنکھیں شہاب ثاقب کی طرح چمک اٹھتیں تو شمشیر جس کی خاموشی اس عرصہ میں آوارگی کی صورت اختیار کر چکی تھی ایک کر گھر آتا اور ننھے شیر کو پاس بٹھا کر شاداں سے کہتا۔ "بیٹا آج جمعرات ہے، دیا تو جلا دیا ہوتا مزار پہ۔ کون جانے اسی تیل کے صدقے خدا ہمارے گھروندے کو پھر سے روشن کر دے۔"

تو شاداں انگڑائیوں کا تانتا باندھتی ہوئی اٹھتی اور کہتی "بہت دیے جلائے چچا، اور پھر دیے بجھ جاتے ہیں تو تیل مجاور الٹ کر لے جاتے ہیں۔ دیے جلانے سے کیا ہوگا؟"

شمشیر کے لیے دلیر کی دوری اب اتنی تشویش ناک نہیں رہی تھی جتنا شاداں کا تغیر، دلیر کی قید کے پہلے ہی سال کے آخری مہینوں میں اس کے دبلے پتلے جسم میں تازہ خون دوڑنے لگا تھا۔ صبح سویرے بناؤ سنگار میں کتنی دیر لگا دیتی، بہترین لباس پہنتی، شبیر کو گھر کتی اور پڑوس میں دھوبیوں کے گھر چلی جاتی۔ ہر مہینے دلیر کی تنخواہ سے دس روپے شمشیر سے جبراً لے لیتی "مجھے بھی زندہ رہنا ہے" وہ کہتی "مہاجن کا حساب شیطان کی آنت بنتا چلا جائے تو میرا کیا بس، میرا بھی تو حق ہے"

شمشیر چپ چاپ دس روپے ہر مہینے اس کے حوالے کر دیتا۔ وہ جانتا تھا کہ جنگ میں صرف جانیں ہی نہیں، آبروئیں اور عزتیں بھی ملیامیٹ ہو جاتی ہیں۔

"سنبھلو، سنبھلو" دادا شہباز کہا کرتا تھا "سنبھلو شمشیر چوکنے ہو کر رہو۔ آخر دوسروں کے بیٹے بھی تو قیدی ہیں"

مگر شمشیر کو سنبھلنے کی توفیق ہی کہاں تھی۔ وہ ہمیشہ کے لیے ڈگمگا چکا تھا۔ اس لٹو کی طرح جو فرش پر گرتا ہے تو ایک جگہ قرار نہیں پا سکتا۔ اس کی نوک کو جیسے زمین کے اندر سے کوئی چیز اچھال کر پرے پھینک دیتی ہے۔ اسے کوئی مرکز نہیں ملتا۔ کوئی منزل میسر نہیں آتی۔ سنبھلنے کے لیے فرصت چاہیئے اور شمشیر کے پاس بہت کم فرصت تھی۔ مہینے میں محاذ جنگ سے ایک دو موتوں کی خبر آ جاتی تو وہ فاتحہ خوانی کے لیے چلا جاتا۔ لوگ امن کے لیے قرآن مجید کے ختم کراتے تو ان میں شامل ہو جاتا اور جب پلٹتا تو پٹواری کہتا "امن؟ امن تو صرف ایک لفظ ہے۔ امن جنگ کا دوسرا نام ہے اور امن کی جنگ اصلی جنگ سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ بنگال کا قحط کیا تھا؟ یہ امن کی جنگ تھی، یہ ہر چیز کی گرانی۔ یہ امن کی جنگ ہے۔ یہ اغوا اور زنا کے نت نئے شوشے، یہ امن کی جنگ ہے —— امن؟ تم امن کے لیے دعائیں مانگتے ہو؟ حالانکہ تم دو صدیوں سے امن کے مزے لوٹ رہے ہو، دو صدیوں سے تم اس چپ چاپ جنگ میں مبتلا ہو۔ ایسی جنگ جو تمھارا خون نہیں بہاتی، صرف تمھارے دماغ اور دل کو نچوڑ کر گلے ہوئے چیتھڑے کی طرح پرے پٹک دیتی ہے —— ارے یہ کتھو نی کہاں گئی؟"

مگر اب جنگ کی تازہ خبریں حوصلہ افزا ثابت ہو رہی تھیں اور شمشیر پٹواری سے بحث کرنے لگا تھا۔ "ارے بھئی امریکی فوج جزیرہ فلپائن پر اتر آئی ہے نا ——— جنگ ختم سمجھو۔"

"یہ نئی جنگ کی ابتدا ہے۔" وہ کھونٹی کو گھٹنے تلے رکھ کر کہتا۔

"روسی برلن میں گھس گئے۔"

"یہ نئی جنگ کی ابتدا ہے۔"

"مسولینی کو سولی پہ چڑھا دیا گیا۔"

"یہ نئی جنگ کی ابتدا ہے۔"

"یورپ میں جنگ ختم ہو گئی۔"

"اب نئی جنگ شروع ہو گی۔"

"جاپان کے شہر ہیروشیما پر ایک نیا بم گرایا گیا ——— ایٹم بم ——— ذیلدار کہہ رہا تھا۔"

"مجھے معلوم ہے۔"

اس روز شمشیر کی آنکھیں چمک اٹھیں اور ہونٹوں کی پپڑیاں اچٹ کر رہ گئیں۔ مدت کے بعد اس نے پھبتی اور مذاق کی طرف توجہ دی۔ "بڑی دیر کے بعد نظر آئے ہو بھئی۔" اس نے ایک نوجوان سے کہا۔ "سناؤ آج کل کون سی گپھا آباد کر رکھی ہے۔"

اور پھر "ابے کھل کر قدم اٹھا۔ یوں چل رہا ہے جیسے تہمد کھل گیا ہو تیرا۔"

ایٹم بم کی خوشی میں اس روز اس نے ایک بڑھیا پہ حملہ کر دیا۔ "لہنگا سنبھال خالہ، بلاوا دے رہا ہے۔"

بڑھیا پلٹ کر کھڑی ہو گئی اور پھر رو دی۔ "تم سچے ہو شمشیر، تمھارا دلیر واپس آجائے گا نا، اور میرا احمد ——— وہ ادھر تین سال ہوئے مصر میں ———" اور وہ روتی ہوئی وہیں بیٹھ گئی۔

"تم مجھ سے مذاق کرتے ہو؟ کیوں نہ کرو، تمھارا بیٹا جو واپس آرہا ہے، اور میرا بیٹا ——— میرا بیٹا۔"

سر پہ ہاتھ رکھ کر وہ اٹھی اور اپنے بیٹے کے ماتم کو تازہ کرتی ساری گلی کو چونکاتی چل دی۔

"ارے!" شمشیر نے گلی میں جمع ہوتے ہوئے لوگوں کی طرف دیکھا۔ ان کے چہروں پر غم اور

غصّہ کے آثار تھے، اور وہ سب نفرت سے شمشیر کو گھور رہے تھے۔" ارے!" شمشیر نے دوبارہ کہا اور سر کو دونوں ہاتھوں میں دبا کر وہیں بیٹھ گیا اور بہت دیر تک بیٹھا رہا۔

رات کو چوپال پر لوگ اکٹھے ہوئے تو ذیلدار نے ایٹم بم کا ذکر چھیڑ دیا" اس کی طاقت پانچ لاکھ ساٹھ ہزار من بارود کے برابر ہوتی ہے۔ جب ہیروشیما پر بم گرا تو جو لوگ باہر تھے وہ وہیں دم توڑ بیٹھے اور جو اندر تھے ——— وہ مارے حبس کے تڑپ پھڑک کر رہ گئے۔ لاشوں کے چہرے تک نہیں پہچانے جا سکتے۔ بم گرا تو سات آٹھ میل اونچا دھوئیں کا مینار ابھر آیا۔ ہیروشیما بالکل مٹ چکا ہے پچاس ہزار سے زیادہ جاپانی مر چکے ہیں۔ ہزاروں ہسپتالوں میں ہیں۔ ہزاروں کا کچھ پتہ ہی نہیں۔ بس اب جنگ کو ختم سمجھو۔"

" ہت تیری نکٹے ناٹے کی "، ایک دہقان بولا" کیسے گرجتا دہاڑتا بڑھا تھا اور کیسے دبوچا انگریز نے "

" نہیں نہیں۔ امریکہ نے " اعتراض ہوا۔

" ابے نہیں۔ انگریز نے "

" امریکہ نے "

" انگریز نے "

" سارے عالم انسانیت کی بدبختی اور بدنیتی نے " پٹواری بولا اور سب اس کی طرف متوجہ ہو گئے" جنگ میں زہریلی گیس استعمال کرنا منع ہے۔ مگر زہریلی گیس سے ہزار درجہ خطرناک ایٹم بم استعمال کرنا جائز ہے۔ بھئی بڑے لچکیلے ہیں جنگی اصول۔ اس وقت جب ہٹلر نے گیس چھوڑنے کی دھمکی دی تھی تو کانفرنسیں بلائی جانے لگیں، کمیٹیاں ہونے لگیں۔ اور اب ——— یہ ایٹم بم "

ذیلدار کڑک کر بولا" منشی بکواس بند کرو "

" میں کہتا ہوں " پٹواری تو جیسے دیوانہ ہو گیا تھا" یہ ایٹم بم کوئی نئی چیز تو نہیں، ہم ہندوستانیوں کے لیے تو ایٹم بم کوئی عجوبہ نہیں۔ بنگال میں کس ایٹم بم نے قحط ڈالا۔ آسام میں کس ایٹم نے لڑکیوں کی جوانیاں لوٹیں۔ راجپوتانہ اور پنجاب میں کس ایٹم بم نے بیواؤں اور یتیموں کی فوج کی فوج

پیدا کر دی۔ ہندوستان پر تو پچھلی دو صدیوں سے ایٹم بموں کی بارش ہو رہی ہے اور تم منہ کھولے ہیروشیما کے ایٹم بم کی باتیں یوں سن رہے ہو جیسے تمھارے لیے جنّت کا دروازہ کھل گیا —— ایٹم بم کی خبریں تم اخباروں میں کیوں پڑھتے ہو۔ قطب دین سے پوچھو، لال بیگ سے پوچھو، نور خاں سے پوچھو، چچا شمشیر سے پوچھو —— اور ——"

"بکواس بند کرو میں کہتا ہوں"۔ ذیلدار گرجا اور پٹواری تھر تھر کانپتا چوپال پر سے اٹھ کر چلا گیا۔

"منشی پاگل ہو جائے گا"۔ ایک شخص نے رائے ظاہر کی۔

مگر ذیلدار کی غضب ناک خاموشی کا تقاضا تھا کہ حاضرین بھی خاموش رہیں۔ کڑی نگاہوں کی گھرکی نے اس اصول توڑنے والے کو کپکپا کر رکھ دیا تھا۔

اب تو نت نئی چٹپٹی خبروں کا تانتا بندھ گیا۔

"برطانیہ میں چھ سال کے بعد سب لوگوں نے صحیح معنوں میں چھٹی منائی۔ جنگ ختم ہو رہی ہے"۔

"روس نے جاپان کے خلاف اعلان جنگ کر دیا"۔

"موئے کو مارے شاہ مدار —— جنگ ختم ہو جائے گی"۔

"جاپان نے ہتھیار ڈال دیئے"۔

"اللہ بس باقی ہوس —— جنگ ختم ہو گئی"۔

"جنگ ختم ہو گئی —— جنگ ختم ہو گئی —— پتلیاں چمک اٹھیں۔ گالوں پہ گلال پھر گئے۔ قیدی اور عدم پتہ بیٹوں کی مائیں لاٹھیاں ٹیکتی گلیوں میں آ گئیں۔

"سچ مچ؟ —— سچ مچ؟"

"ہاں ہاں جنگ ختم ہو گئی۔ جنگ بالکل ختم ہو گئی۔ اب جنگ نہیں ہو گی۔ اب جنگ بالکل نہیں ہو گی"۔

"سچ مچ؟ —— سچ مچ؟"

اتنی بڑی سچائی پر ایمان لانے کے لیے بھی تو شیر کا کلیجہ چاہیے۔
"جنگ ختم ہو گئی شاداں بیٹی" شمشیر گھر جاکر چلّایا اور شیر کو اٹھاکر اس پر بوسوں کی بوچھاڑ کر دی۔
"سچ مچ؟" ——— مگر شاداں کے اس استعجاب میں مسرّت کے بجائے صرف حیرت تھی۔
"ارے کوئی یقین نہیں کرتا۔ شیر بیٹا، تیرا ابّا اب واپس آجائے گا۔"
"شچ؟" ننھے نے بڑی بڑی گول مول آنکھیں پھاڑ کر دادا کو گھورا۔ "تیا لائے دا؟"
"تمہاری سواری کا گھوڑا۔ عید کے لیے کپڑے اور ٹوپیاں اور بوٹ اور چھڑی اور ..."
"پتاخے۔"
"ہاں ہاں پٹاخے اور پھلجھڑیاں اور ..."
"خاک لائے گا۔" شاداں نے بگڑ کر کہا۔
"کیوں؟" جیسے شاں نے بوڑھے کا منہ نوچ لیا تھا۔
"تنخواہ تو ساری مہاجن ہضم کر گیا۔ وہ تو اپنی جان بچاکر بھی لائے تو شکر کرو خدا کا۔"
اور اس نے نقرئی چوڑیوں کی گھنگھریاں چھنکائیں اور شیر کو گھسیٹ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔
کانٹوں کا وہ گچھا جو دلیر کی قید اور شاداں کی سرد مہری نے اس کے حلق میں ٹھونس رکھا تھا اچھل کر جیسے اس کے دماغ میں کودنے لگا۔ مگر اب جنگ ختم ہو چکی تھی اور اندر ہی اندر گھلنے سے یہی بہتر تھا کہ دلیر کی راہ دیکھی جائے۔
دو تین ہفتے بعد اسے معلوم ہوا کہ انگریزوں نے سنگاپور پر دوبارہ قبضہ کر لیا ہے، اور پھر آہستہ آہستہ خبریں آنے لگیں کہ قیدیوں کے جہاز ہندوستان آرہے ہیں۔ دامنِ کوہ کے ایک گاؤں کا نوجوان جو سنگاپور میں جاپان کا قیدی رہا، گھر واپس آچکا ہے۔ اس نے ایک روز ہرکارے کی زبانی سنا، اور اسی روز ایک ننھی سی بقچی کاندھے پر لٹکاکر اسی گاؤں کی راہ لی۔ گاؤں والوں نے بھی اپنے اپنے عزیزوں کے نام اور نمبر لکھ کر دیے، اور وہ ایک ذمہ دارانہ حیثیت سے بالکل پرانے بادشاہوں کے ایلچیوں کی طرح پہاڑ کے دامن کی طرف چلا۔

وہاں جا کر اسے نو دارد سپاہی کی زبانی معلوم ہوا کہ قیدی بے شمار تھے اور انھیں ملایا اور جاوا اور دوسرے جزیروں میں بکھیر دیا گیا تھا۔ اس لیے وہ کوئی یقینی خبر نہیں دے سکتا تھا۔ مایوس ہو کر گھر کو پلٹا۔

تھکا ماندہ کھانستا کھنکارتا جب وہ اپنے گاؤں سے ایک میل کے فاصلے پر پہنچا تو اس نے کچھ دور پٹواری کو اپنی طرف آتا دیکھا۔ دیہاتیوں کا ایک جمگھٹا بہت پرے چپ چاپ کھڑا پٹواری کی طرف دیکھ رہا تھا۔

سورج غروب ہونا چاہتا تھا۔ مگر جیسے شمشیر کے گاؤں میں پہنچ جانے کا منتظر کھڑا تھا۔ دھوپ پیلی پڑ گئی تھی۔ درختوں کے پتے اداس اور نڈھال ہو کر بل کھا گئے تھے۔ کھیتوں پر مردنی کا عالم تھا۔ ٹھکانوں کو جاتے ہوئے پرندوں کی آوازوں میں شیون تھا۔ پگڈنڈی کے لہراتے ہوئے زریں فیتے پر ایک گدھا دھول میں نہا رہا تھا۔

"واپس آگئے چچا؟" پٹواری نے پوچھا۔

"ہاں۔ واپس آگیا ہوں نامراد!" شمشیر نے کہا "مگر تم کہاں چلے؟"

"میں یہاں سے دور جا رہا ہوں ہمیشہ کے لیے!"

"کیوں؟ خیریت تو ہے نا؟"

"خیریت؟" پٹواری کے ہونٹوں پر ایک عجیب زہریلی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور بکھر وہیں چمٹ کر رہ گئی "خیریت امن کی طرح بے معنی لفظ ہے، امن کے لفظ سے معنی نچوڑنے کے لیے ماسکو میں مولوٹاف برنز اور بیون کی کانفرنس ہونے والی ہے اور تمھیں خیریت کا مطلب سمجھانے کے لیے وہ مجمع تمھارا منتظر کھڑا ہے۔ جاؤ بابا، تم جو ہر کسی کا مذاق اڑاتے تھے، تم جو بڑی بڑی خبریں سننے کے شوقین تھے، تم جو ہنسنے ہنسانے کے سوا کچھ جانتے ہی نہ تھے، جاؤ وہاں اس مجمع میں دادا شہباز سے پوچھو کہ خیریت کیا چیز ہے، اور پھر اپنے گھر جانا، وہاں کہیں طاق پر تمھارے بیٹے کا تار پڑا ہوگا۔ وہ آرہا ہے!"

"دلیر آرہا ہے؟" شمشیر بقچی پھینک کر پٹواری سے لپٹ گیا۔ مگر وہ لوہے کی لاٹھ کی طرح

بے حس و حرکت کھڑا رہا اور اسی خوفناک سنجیدگی سے بولا "ہاں واپس آرہا ہے تمہارا دلیر، سو تم تار اٹھا کر شیر کو پکارنا۔ جسے کل صبح اس کی ماں نے دلیر کا تار ملنے کے بعد لاہور کے کسی یتیم خانے کے سفیر کے حوالے کر دیا ہے "

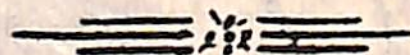
"تار ملنے کے بعد ؟"

"اور پھر پکارنا۔ شاداں، شاداں بیٹی۔ تمہاری وہ شاداں بیٹی جو شاید ہیروشیما پر ایٹم بم گرائے جانے کی منتظر تھی، جو رات کو تمہارے پڑوس کے دھوبی کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ بتوں کی طرف "

"کیا کہہ رہے ہو ؟"

"اور پھر تجوری کھول کر وہ روپیہ گننا جو تم نے جنگ کی برکت سے کمایا۔ تمہیں امن اور خیریت کے تمام معانی ازبر ہو جائیں گے "

وہ شمشیر کے مردہ ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں دبا کر پلٹا اور پگڈنڈی پر ہو لیا۔ سورج دریا کے پرلے کنارے پر پھیلی ہوئی پہاڑیوں میں ڈوب چکا تھا۔ شفق نے پٹواری کے سفید لباس میں آگ سی لگا دی۔ وہ ایک شعلہ سا بن گیا ـــــ دھرتی کے کلیجے سے نکلتا ہوا شعلہ ـــــ رواں دواں۔ رواں دواں ـــــ اور پھر یہ شعلہ بجھنے لگا۔ دھوئیں کا ایک بونا سا بن گیا۔ مشرقی افق کی دھند میں گھلتا ہوا یہ سایہ بڑھتا گیا۔ پھیلتا گیا۔ ناپید ہوتا گیا ـــــ اور پھر اسی افق سے چاند بن کر ابھرا۔ جگمگاتا ہوا، ہنستا ہوا ـــــ جیسے مغرب میں ڈوبتے ہوئے سورج کے تعاقب میں ہے۔



وسمول

سفید بالوں کو چمکیلا سیاہ بناتا ہے

'وسمول' سائنٹیفک طریقوں سے بنایا ہوا بالوں کو صحیح معنوں میں سیاہ کرنے والا۔ بالوں کو تقویت پہنچانے والا خوشبودار ہیئر ڈریسنگ ہے۔ ان تمام خوبیوں کے باوجود 'وسمول' کی قیمت کسی بھی اچھے ہیئر آئل سے زیادہ نہیں ہے۔

وسمول

بالوں کو یقینی طور پر سیاہ اور چمکیلا بناتا ہے

دو شکلوں میں ملتا ہے:
رقیق ہیئر آئل کی شکل میں اور پومیڈ کی شکل میں۔ سب ہی دوا فروشوں کے یہاں اور اسٹورز میں ملتا ہے۔





ہائی جینک ریسرچ انسٹیٹیوٹ
پوسٹ بکس نمبر ۱۱۴۲، بمبئی نمبر ۱

احمد شریف

بے آباد جزیرے

کوچی پہنچ کر سب سے پہلے راماشی سے ملاقات ہوئی۔
ہمیں اس جزیرے پر اترے تیسرا روز تھا۔ بارش موسلادھار برس رہی تھی۔ میں اپنی ہٹ میں پلنگ کی پٹی پر پاؤں رکھے، ٹانگیں پسارے کرسی میں نیم دراز اونگھ رہا تھا کہ راماشی اسی طرح میری کرسی کے قریب آکر گری جیسے کسی نے اسے دروازے میں کھڑی کر کے دھکا دیا ہو۔ میں نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ ہڈسن چوکھٹ سے کندھا بھڑائے کھڑا تھا۔ آتشدان میں بھڑکتے شعلوں کا عکس اس کی سرخی مائل بلوری آنکھوں میں جھلملا رہا تھا۔ وہ مجھے حیران دیکھ کر مسکرایا اور کہنے لگا۔
"اِٹ اِز فور یو کیپٹن"۔
پھر راماشی سے مخاطب ہو کر تحکمانہ لہجے میں جاپانی میں کوئی بات کہی۔ وہ تڑپ کر اٹھی اور جلدی جلدی میرے بوٹوں کے تسمے کھولنے لگی۔ ہڈسن اسے اشاروں پر ناچتی پاکر ہنسا اور لڑکھڑاتا ہوا اپنی ہٹ کی طرف چلا گیا۔ وہ کانپ رہی تھی۔ میرے بوٹ اتار کر وہ فرش پر بیٹھ گئی اور اپنی فراک کے دامن سے صاف کرنے لگی۔
میں نے اس کے سراپا پر نظر ڈالی۔ وہ سڈول جسم اور زردی مائل رنگ والی قبول صورت لڑکی تھی۔ صورت اجڑی اجڑی تھی۔ خدوخال کا تناسب بکھرا ہوا تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر قریب کھینچ لیا۔ وہ بلا حیل وحجت گردن جھکا کر کرسی کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔

یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب ہیروشیما اور ناگاساکی جل کر راکھ ہو چکے تھے۔ ان کے کھنڈروں تلے جاپان کی عظمت دفن ہو کر رہ گئی تھی اور فاتح فوجیں اس ملک پر اپنا قبضہ مکمل کرنے آئی تھیں۔

ہڈسن کی بدولت پچھلے تین روز میں کئی جاپانی لڑکیاں فوجی افسروں کے تصرف میں لائی جا چکی تھیں۔ وہ ایسی لڑکیوں کو تلاش کرنے اور ان کے کس بل نکالنے کا ماہر تھا۔ آتشدان میں لکڑیاں چٹخیں تو لمحہ بھر کو سناٹا ٹوٹ گیا۔ میں نے ٹھوڑی پکڑ کر راماشی کا چہرہ اوپر اٹھایا۔ اس کی پلکوں پر لرزتے آنسو رخساروں پر ڈھلک آئے اور وہ کرسی کے بازو پر سر رکھ کر رونے لگی۔ وہ روتی رہی اور میں اس کے بکھرے ہوئے بالوں کو انگلیوں کی کنگھی بنا کر سنوارتا رہا۔

اس کے طرزِ عمل میں کوئی انوکھی بات نہ تھی۔ ہڈسن کے ہتھے چڑھ کر جو بھی لڑکی آتی پہلے پہل وہ طوفان کی زد پر آئی ہوئی نازک شاخ کی طرح لرزتی، نوگرفتار پنچھی کی طرح پھڑپھڑاتی اور پھر اس ماحول میں اس طرح رچ بس جاتی جیسے اسی ماحول کا ایک حصہ ہو۔ نیا ماحول ان لڑکیوں کو ایسا راس آتا کہ وہ رات گئے تک وہیں اٹھلاتی پھرتیں۔ مترنم قہقہے گونجتے رہتے اور سپیدۂ سحر کے قریب وہ مچھلی، گوشت اور پھلوں کے بند ڈبے سنبھالے چپکے سے کھسک جاتیں —— راماشی بھی انھیں لڑکیوں میں سے ایک تھی۔

تھوڑی دیر بعد اس نے سر اٹھا کر سرخ سرخ آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور پھیکی سی مسکراہٹ چہرے پر لا کر صاف ستھری انگریزی میں بولی۔

"آئی ایم سوری کیپٹن"!

اور اٹھ کر اس طرح کام میں لگ گئی جیسے اپنے ہی گھر چلی آئی تھی۔

جن حالات میں وہ وہاں لائی گئی تھی وہ بڑے افسوسناک اور تکلیف دہ تھے۔ پھر بھی اس کا آنا غنیمت تھا۔ وطن سے دور آکر میں تنہا اور اداس تھا۔ ماحول پر افسردگی ٹوٹ کر چھائی ہوئی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ میرے اور اس کے درمیان اجنبیت کے فاصلے

جلدی سے سمٹ جائیں۔ پھر وہ کھلکھلا کر ہنسنے اور موتیوں کی لڑی ٹوٹ کر بکھر جائے۔ ہٹ کے نیم تاریک ماحول میں میٹھی میٹھی سرگوشیاں ابھریں اور رسیلے لبوں کا رس شہد بن کر ٹپکے۔
راماشی کے گداز اور لچکیلے جسم کا خیال آتے ہی پلنگ سرسوں کے پھولوں سے لبالب بھر گیا۔
میں رات کے حسین تصور باندھے بیٹھا تھا کہ وہ چپکے سے آئی اور کرسی سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے کولہوں کا بیضوی ابھار کرسی کے بازو پر پھیل گیا۔ میرا جی چاہا اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر گود میں بٹھا لوں کہ میری نظر اس کے رخساروں پر پھیلی گیلی گیلی لکیروں پر پڑی۔ تصورات کا آئینہ گر کر چکنا چور ہو گیا۔

وہ چلی گئی اور رات اور بھی ویران ہو گئی۔

اگلے روز وہ آئی ——— اور پھر روزانہ آتی رہی۔ میں جب بھی اس کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کرتا مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے لاتعداد بگولے اپنے دامنوں میں زرد پتوں کے ہجوم لیے ویران قبرستانوں میں چکراتے پھر رہے ہوں۔ وہ اس آسیب زدہ مکان کی طرح پراسرار دکھائی دیتی جس کی کھڑکیاں اور دروازے مدت سے بند پڑے ہوں۔ اس کی موجودگی میں ماحول دم سادھ لیتا۔ کربناک سناٹا چھا جاتا۔ ہٹ میں اس کے قدموں کی چاپ اس طرح ابھرتی جیسے وقت دھیرے دھیرے کراہ رہا ہو اور پھر سناٹے پر سناٹے کی ایک تہہ اور چڑھ جاتی۔

اس پر موسم بڑا گندہ اور واہیات تھا۔ دن بھر دھند چھائی رہتی۔ راتوں کو سرد ہوائیں چھت کی ٹائلوں میں منہ چھپا کر روتی رہتیں۔ ایسے میں راماشی کی وجہ سے خواہ مخواہ اعصاب پر عورت سوار ہو جاتی۔ سچی بات ہے میں اس سے جان چھڑانے کی تجویزیں سوچنے لگا۔

اس روز صبح سے برف گر رہی تھی۔ میں جس وقت میس (MESS) میں داخل ہوا ہڈسن بار کے کاؤنٹر پر جھکا پی رہا تھا۔ میں نے دروازے میں رک کر کپڑوں پر سے برف جھاڑی۔ وہ میرے بوٹوں کا اوپر سے نیچے تک جائزہ لے کر بولا۔

"گھوڑسواری سیکھ رہے ہو؟"

"سواری کے لیے گھوڑا کہاں ہے؟"

میں نے الٹا اسی سے سوال کیا اور کاؤنٹر سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے مجھے آنکھ ماری اور ہنس کر بولا۔

"گھوڑی تو ہے" پھر مڑ کر بارمین سے کہنے لگا "ایک پیگ وہسکی چھوٹا والا"

میں نے اس کا شانہ ہلا کر اپنی طرف متوجہ کر کے کہا۔

"راماشی کو کسی اور کے ساتھ نتھی کر دو"

"کیوں؟"

"کیا ضرورت ہے آخر ان لڑکیوں کی"

میں نے بیزاری سے کہا۔ وہ منہ کھول کر میری صورت تکنے لگا۔ بارمین نے گلاس میری طرف سرکا دیا۔ میں گلاس ہاتھ میں لے کر اس سے کھیلنے لگا۔ وہ کھلکھلا کر ہنسا اور کہنے لگا۔

"مائی ڈیر کیپٹن۔ ناک"

اس نے اپنی ناک کی پھننگ چٹکی میں لے کر مروڑی۔ اس کی سرخ ناک اور بھی سرخ ہو گئی۔ پھر وہ میری طرف جھک کر آپ ہی آپ اپنی بات کی وضاحت کرنے لگا۔

"لڑکیاں قوم کی ناک ہوتی ہیں۔ جب وہ راتیں غیر مردوں کے ساتھ بسر کریں تو ناک کٹ جاتی ہے"

اس نے جلدی سے ہاتھ بڑھا کر میرے ہاتھ سے گلاس لیا اور ایک ہی گھونٹ میں وہسکی کا چھوٹا پیگ حلق سے اتار لیا اور پھر زور سے میرا کندھا تھپتھپا کر ہنستا ہوا باہر نکل گیا۔

میں ہٹ میں واپس آیا تو راماشی جا چکی تھی۔ میں کمبل اوڑھ کر بوٹوں سمیت پلنگ پر لیٹ گیا۔ پتہ نہیں کیوں ہڈسن کی سرخ ناک میری آنکھوں میں گھسنے لگی۔ اچانک میرے سرہانے کوئی درخت کے گیلے تنے پر زور زور سے کلہاڑے چلانے لگا۔ میں کمبل پرے پھینک کر جلدی سے اٹھا۔ ہٹ سنسان پڑی تھی۔ باہر نکل کر دیکھا تو حد نظر تک برف کی

چادریں بچھی ہوئی تھیں ہٹس کا بے ترتیب سلسلہ سیاہ دھبوں کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ میرے پڑوس میں پچیس تیس گز کے فاصلے پر ہڈسن کی ہٹ تھی۔ میں اس طرف لپکا۔

ہٹ میں گھستے ہی سب سے پہلے میری نظر ہڈسن پر پڑی۔ وہ کمان کی صورت پرلی طرف منہ کیے فرش پر پڑا تھا۔ اس کے پیروں میں راماشی کھڑی تھی۔ اس کا فراک تار تار ہو کر شانوں پر جھول رہا تھا۔ اس کی گول گول چھاتیوں پر لمبی خراشیں تھیں۔ ان خراشوں سے خون رس رہا تھا۔ اس کی نگاہیں ہڈسن پر مرکوز تھیں۔

میں نے ہڈسن کا کندھا پکڑ کر اسے اپنی جانب کروٹ دی۔ اس کی آنکھوں اور منہ کے درمیان ایک بھیانک سوراخ منہ پھاڑے مجھے گھور رہا تھا۔ گولی ناک کو توڑتی ہوئی حلق میں اتر گئی تھی۔ اس نے ہچکی لی اور راماشی کے فراک کی دھجیاں اس کی مٹھیوں میں دب کر رہ گئیں۔ راماشی ابھی تک بے حس و حرکت کھڑی تھی۔ میں نے جھپٹ کر اس کے ہاتھ سے ریوالور چھینا اور رومال سے صاف کر کے ہڈسن کے پہلو میں ڈال دیا۔ اس کی مٹھیوں سے راماشی کے فراک کی دھجیاں نکالیں۔ اپنے اور راماشی کے قدموں کے نشانات مٹائے اور اسے اپنی ہٹ میں لے آیا۔

راماشی کمبل اوڑھے پلنگ پر بیٹھی تھی۔ اور میں اس کے سامنے بیٹھا سوچ رہا تھا ——— ناک کسری کا کیا ہے ——— کٹنے پر آئے تو پل بھر میں کٹ جائے ——— میں اسے جیپ میں بٹھا کر اس کے گھر چھوڑ آیا۔

فاتح فوجوں کے جنگل میں آگ لگ گئی اور جب جاپانی لڑکیوں کا ریوڑ کمانڈر کے روبرو پیش کیا گیا تو خلافِ توقع راماشی کے چہرے پر گلاب سے کھلے ہوئے تھے۔ کمانڈر نے اس سے پوچھا۔

"کیپٹن ہڈسن کو مارا؟"

راماشی نے اتنے زور سے نفی میں سر ہلایا کہ اس کے بالوں کی جھالر پیشانی پر بکھر گئی۔

میں کمانڈر کی طرف جھکا اور نظریں نیچی کر کے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

"کل شام یہ لڑکی میرے ساتھ تھی!"

کمانڈر نے مسکرا کر معنی خیز نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور دوسری لڑکی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

میں ہٹ کی طرف آتے ہوئے اپنے اندر والے مجنوں کی بوالعجبیوں پر دل ہی دل میں ہنسا۔ میں اس اجنبی لڑکی کو بھلا کیوں موت کے منہ سے بچاتا پھر رہا تھا۔ میرا اس کے ساتھ کیا رشتہ تھا! ——— میں تو اس ملک میں جاپانی قوم کے تابوت میں آخری کیل ٹھوکنے آیا تھا۔
ہٹ میں داخل ہوا تو ہراماشی میری منتظر تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ بھاگی ہوئی آئی اور میرے گلے میں بازو حمائل کر کے جھول گئی۔ میں اسے کلاوے میں لے کر پلنگ پر چت لیٹ گیا۔ میرے سینے پر ریت کے گدگدے ٹیلے ذرا دیر کو دبے اور ہوا کا دوسرا ریلا انھیں پھر سنوار گیا۔ وہ ٹانگیں سکیڑ کر مجھ پر سوار ہو کر بیٹھ گئی اور اس نے دونوں ہاتھوں کا بوجھ میرے سینے پر ڈالتے ہوئے جھک کر میری آنکھوں میں جھانک کر پوچھا۔

"تم دیوتا ہو؟"

"نہیں۔" میں نے اسے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر اپنے پہلو میں لٹا لیا اور اس کی جانب کروٹ لیتے ہوئے کہا۔ "میں اُلّو کا پٹھا ہوں۔"

"اوں!" وہ نچلا ہونٹ لٹکا کر کسمسائی اور پھر نظریں جھکا کر بولی۔ "کل امّی آپ کو سڑک تک دیکھنے آئی تھیں پر آپ ٹھہرے ہی نہیں۔"

"تم نے ٹھہرنے کے لیے تھوڑا ہی کہا تھا!"

"مجھے خیال ہی نہ رہا۔" اس نے بھولپن سے کہا۔ "پھر امّی نے جونہی مجھے دیکھا لپٹا کر زار و قطار رونے لگیں۔ ان کے دل میں تو اسی روز سے چور تھا جب ہڈسن مجھے چھاپہ مار کر گرفتار کر کے لایا تھا۔ امّی کا خیال تھا مجھے رات سے پہلے پہلے گولی مار دی جائے گی اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو گی۔"

جاپانی لڑکیوں کو رام کرنے اور ان سے بلا تامّل اپنی بات منوانے کے لیے ہڈسن اسی

طرح ان لڑکیوں کو ان کے گھروں سے گرفتار کر کے لایا کرتا تھا۔ میں نے شرارتاً پوچھا۔

"گرفتاری کے بعد تمھارا کیا خیال تھا؟"

"میرا خیال ـــــ" اس نے بات کرتے کرتے رک کر میری طرف دیکھا اور کہنے لگی۔

"میرا خیال تھا میں رات کی رات میں کہیں کی نہ رہوں گی!"

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں اس لڑکی کو صدیوں سے جانتا ہوں ـــــ میں نے اس کے سر کے نیچے رکھے ہوئے بازو کا حلقہ تنگ کر کے اسے سینے سے لگا لیا۔ بے ہنگم دھڑکنوں کے شور سے دل کے کواڑ بجنے لگے۔ اس نے اپنے اور میرے درمیان دونوں مٹھیوں کی دیوار حائل کر کے ایک دم سنجیدہ ہو کر پوچھا۔

"تم ان لوگوں کے ساتھ یہاں کیوں آئے ہو؟"

میں نے کہا۔

"میں تمھیں بھگا لے جانے آیا ہوں"

وہ تڑپ کر اٹھی اور کہنے لگی۔

"تو پھر بھگا لے چلو۔ یہاں میرا دم گھٹ رہا ہے ـــــ ابھی بھگا لے چلو!"

میں اسے بھگا کر اس کے گھر لے گیا۔ اور وہیں اس کے پاپا سے عجیب سی ملاقات ہوئی۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ میں اس کی کال کوٹھری میں جا گھسا۔

راماشی مجھے ایک کمرے میں بٹھا کر باورچی خانے میں چلی گئی۔ میرا خیال تھا اس کا گھر جاپانیوں کے روایتی گھر کی طرح ہو گا۔ مگر وہاں نہ فرش پر چٹائیاں بچھی تھیں نہ کمرے کے وسط میں نیچی تپائی پہ بلوری کٹوروں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ میں نے سوچا جس طرح ہماری تہذیب کا گاؤ تکیہ اور چاندنی دیوان خانے سے اٹھ کر کوٹھری میں پہنچ گئے ہیں اسی طرح جاپانی تہذیب بھی بوریا بستر لپیٹ کر کسی اندھیرے کمرے میں دبکی پڑی ہو گی۔ میں متجسس سا اٹھ کر ٹہلنے لگا۔

اس کمرے سے ملا ہوا ایک اور کمرہ تھا۔ درمیانی دروازہ بند تھا۔ میں دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ وہاں گھپ اندھیرا تھا۔ کہیں سے روشنی کا گزر نہ تھا۔ کھڑکیوں اور دروازوں

پر دبیز پردے پڑے ہوئے تھے۔ جب آنکھیں اندھیرے سے قدرے مانوس ہوئیں تو میں نے دیکھا کونے میں ایک ادھیڑ عمر آدمی سر نیہوڑائے کرسی پر بیٹھا دیوار کے ساتھ رکھا ہوا پالنا جھلا رہا ہے۔ وہ میری آمد سے بے نیاز پالنا جھلاتا رہا۔ اس برف خانے میں میرا دم گھٹنے لگا۔ میں نے یوں ہی کھڑکی کا پردہ ذرا سا سرکا دیا۔ روشنی کا ایک قتلہ اس طرح اندھیرے میں آن گرا جیسے پردے سے لگ کر کھڑا ٹھٹک گیا ہو۔ روشنی دیکھ کر وہ ادھیڑ عمر آدمی کرسی پر اچھلا اور چلانے لگا۔ راما شی نہ جانے کہاں سے میری طرف لپکی اور کہنے لگی۔

"پردہ گرا دو۔ ساشا کو لُو لگ جائے گی!"

وہ مجھے دوسرے کمرے میں لے آئی۔ مجھے کریدنی سی لگی ہوئی تھی۔ میں نے پوچھا۔

"ساشا کون ہے؟"

اس نے آنکھیں نیم وا کر کے بغور میری طرف دیکھا اور کہنے لگی۔

"میرا بیٹا!"

ساتھ ہی نڈھال ہو کر دھپ سے صوفے پر گر گئی۔ اس کا زرد چہرہ گہرا زرد ہو گیا۔ مجھے دھچکا سا لگا۔ پرائی عورت سے دل لگا بیٹھنے پر شرمسار ہو کر میں نے سر جھکا لیا۔ کمرہ کسی اندھے کنوئیں کی طرح بھائیں بھائیں کرنے لگا اور پھر اس اندھے کنوئیں سے راما شی کی آواز آئی۔

"ہماری ایک چھوٹی سی دنیا تھی جہاں میں، ہاراکو اور ہمارا ساشا رہتے تھے۔ ہاراکو ہیروشیما کے مقامی ہسپتال میں ڈاکٹر تھا۔ پھر ہماری بدلی یوکوہاما ہو گئی۔ یوکوہاما جانے سے پہلے میں ایک دن کے لیے امی اور پاپا سے ملنے یہاں چلی آئی۔ جس روز میں یہاں پہنچی اسی روز ہیروشیما پہ بجلی گرمی اور میں بھسم ہو کر رہ گئی۔

"پتہ نہیں میں کب تک گرداب میں پھنسی غوطے کھاتی رہی —— پاپا، ساشا اور ہاراکو کو ڈھونڈنے گئے اور جب وہ واپس آئے تو ان کی آنکھوں میں سر بریدہ ہیولے دست و گریباں تھے۔ وہ بے حال سے دروازے کے چوکھٹے میں جڑے کے جڑے رہ گئے۔ ان کا منحنی سا وجود اور بھی سکڑ گیا۔ میں ان کی طرف بھاگی اور ماں ہوتے ہوئے پتہ نہیں کیسے منہ پھاڑ کر پوچھا

"پاپا ساشا مر گیا؟"

"انھوں نے مجھے گود میں لے لیا اور سینے سے لگا کر بولے۔

"بگلی ساشا نہیں مر سکتا۔ اسے کوئی نہیں مار سکتا۔"

"پھر انھوں نے چھت پر سے وہ پالنا اتارا جس میں امّی مجھے بچپن میں لٹا کر جھلایا کرتی تھیں۔ اور اب ـــــ اب پاپا اس اندھیرے کمرے میں بیٹھے اس پالنے کو جھلاتے رہتے ہیں۔"

راماشی کی آنکھیں ابھی تک ماضی کی راکھ میں دفن یادوں کے ذخیرے کو کرید رہی تھیں۔ میں نے اس کے پاس بیٹھ کر پکارا۔

"راماشی!"

وہ اس بچے کی طرح چونکی جس نے ابھی ابھی ڈراونا خواب دیکھا ہو۔ میں نے اس کے شانوں کے گرد بازو ڈال کر کہا۔

"راماشی! ساشا کبھی نہیں مر سکتا۔"

اس نے حیرانی سے میری طرف دیکھا اور میرے گندے سر پہ ہاتھ رکھ کر رونے لگی۔ ہمارے درمیان اجنبیت کے فاصلے لمحہ بھر میں سمٹ گئے۔

راماشی میرے خیالوں میں بس گئی۔

ایک رات ہم بتی بجھائے پلنگ پر خاموش لیٹے تھے۔ راماشی کھڑکی سے جھانکتے چودھویں کے چاند کو دیکھ رہی تھی اور میں دو اتھاہ جھیلوں میں جھلملاتے چاند کو تک رہا تھا۔ سرد ہوائیں ہٹ کی چھت پر ٹائلوں میں چھپی گنگنا رہی تھیں۔ اس نے میری طرف کروٹ لی اور پوچھنے لگی۔

"تمھارے دیس کا چاند بھی ایسا ہی ہے؟"

میں نے کہا۔

"میرے دیس میں تو چاند کی کھیپ ہوتی ہے۔"

"کھیپ!!!"

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ میں نے کہا۔

"اور کیا —— میرے دیس میں جب گاؤں کی گوریاں شفاف پیشانیوں پر جھومر سجائے
ترنجن میں بیٹھ کر چرخے کاتتی ہیں تو آسمان کا چاند بدلی میں چھپ جاتا ہے۔"
وہ سوچ میں ڈوب گئی۔ پھر اس نے مستفسرانہ نگاہوں سے میری طرف دیکھ کر پوچھا۔
"تمہارے دیس کی لڑکیاں بہت خوبصورت ہیں؟"
میں اس کے ذہن میں کھدبداتے وسوسوں کو بھانپ کر دل ہی دل میں مسکرایا اور
جذباتی بن کر کہا۔
"مکئی کی روٹی اور سرسوں کا ساگ کھانے والی لڑکیاں خوبصورت نہیں ہوں گی تو کیا
بدصورت ہوں گی! —— ان کے چہروں پر تو چناروں کی آگ کا پرتو رقص کرتا ہے۔
ان کی لمبی پلکوں کی گھنیری چھاؤں میں تھکے ہارے مسافر بیٹھ کر سستاتے ہیں اور جب وہ چلتی ہیں
تو دھرتی ان کے قدموں میں بچھ جاتی ہے۔"
وہ مرجھا گئی اور کہنے لگی۔
"میرے چہرے پر تو سرسوں پھولی ہوئی ہے۔ ایک بھولے بھٹکے مسافر نے میری پلکوں کے
سائے میں دو گھڑی کو ڈیرا ڈالا تھا۔ بیچارہ اس سائے میں جل کر راکھ ہو گیا۔"
وہ اس وقت چاندنی کا دوپٹہ اوڑھے، پاؤں لٹکائے پٹی پر بیٹھی تھی۔ پلکوں کی جھالر
پر دو موتی جھلملا رہے تھے۔ میں چپکے سے اٹھا اس کے پیروں میں فرش پر آلتی پالتی ماری اور
دونوں ہاتھ باندھ کر کسی پجاری کی طرح سر جھکا لیا۔ میرے جی میں آئی اس سے کہوں ——
تُو تو ایشیا کی بیٹی ہے —— لیکن وہ جلدی سے اٹھی اور میرے ہاتھ تھام کر میری گود میں لیٹ
گئی اور کہنے لگی۔
"مجھے اپنے دیس لے چلو۔ میں وہاں ترنجن میں بیٹھ کر چرخہ کاتوں گی۔"
اس کی آواز میں پہاڑی جھرنوں کا سنگیت تھا۔ پھر بھی نہ جانے کیوں مجھے اس کی بات
کا یقین نہ آیا۔
فتح کا سہرا در اصل ابراہم کے بیٹوں کے سر تھا۔ جب اس سہرے کی نمائش گلی گلی

ہونے لگی اور ہم اتنے دنوں سے اس علاقے میں گولہ بارود کے ذخیرے کو فلیتہ دکھانے اور جاپانی فوج کے مردے پر سو دُرّے مارنے کی جو کاغذی کارروائیاں کر رہے تھے ان کو عملی جامہ پہنانے کا کام انھوں نے اپنے ہاتھوں میں لے لیا تو ہماری حیثیت براتیوں کی سی ہو گئی اور پھر براتیوں کی ٹولیاں ایک ایک کر کے واپس ہونے لگیں۔

ہڈسن کی لائی ہوئی جاپانی لڑکیاں پرانے ڈیرے چھوڑ کر نئے ڈیروں کی طرف چل دیں۔ پرانے ڈیرے ویران ہو گئے۔

کوہجی میں وہ میری آخری رات تھی۔ راماشی اور میں دو بے آباد جزیروں کی طرح پڑے تھے اور ہمارے درمیان ابھی سے کھاری پانیوں کی دیوار حائل ہوتی جا رہی تھی۔ میں اس سے بہت سی ان کہی باتیں کہنا چاہتا تھا۔ لیکن اس پنچھی کی طرح حیران تھا جس کے آشیانے کے چار تنکے آندھی اڑا لیے جا رہی ہو۔ جب خاموشی ناقابل برداشت ہو گئی تو میں نے جھنجھلا کر اسے جھنجھوڑ ڈالا اور اسے سامنے بٹھا کر پوچھا۔

"مجھ سے شادی کرو گی؟"

وہ شرما گئی۔ اس کے رخسار گلابی ہو گئے۔ میں نے اس کے قریب ہو کر کہا۔

"میں چاہتا ہوں کہ تمھاری مانگ میں سیندور دیکھ کر میرے گھر والے بنا کہے سمجھ جائیں کہ میں دلہن لے کر آیا ہوں ——— چلو، ابھی کسی پگوڈے میں چل کر شادی رچا لیں۔"

اس نے مسکرا کر میری آنکھوں میں دیکھا اور مان گئی۔ لیکن جب چلنے کے لیے تیار ہوئے تو وہ دروازے میں رک کر کھڑی ہو گئی اور اداس لہجے میں بولی۔

"یہاں کی شادی کا اب کیا اعتبار! ——— جہاں شام کی شادی صبح کو ٹوٹ جائے ——— تم مجھے ساتھ لے چلو۔ میں جانتی ہوں سورج نکلتے ہی تمھارا جہاز روانہ ہو گا۔ میں آپ ہی پہنچ جاؤں گی۔"

خیالات کی آندھی نہ جانے اسے کیسی کیسی بھول بھلیوں میں اڑائے لیے پھر رہی تھی۔ میں کہنے ہی والا تھا کہ تمھیں دل میں چھپا کر لے جاؤں گا کہ وہ جلدی سے مڑی اور چلی گئی۔

اس رات کے پچھلے پہر میرے ساتھیوں نے چوری چوری وہ کیبن دلہن کی طرح سجایا جس میں راماشی سفر کرنے والی تھی۔ وہ اپنے وعدے کے مطابق علی الصبح آگئی۔ اس کے چہرے پر دلہنوں کا سا نکھار تھا۔ سرخ فراک کا عکس چہرے پر جھلک رہا تھا۔ چمکیلی آنکھوں میں بجلیاں کوندرہی تھیں اور گلابی ہونٹوں سے رس چھلک رہا تھا۔ وہ مجھے بے محابا اپنی طرف دیکھتے پاکر شرما گئی اور ریلنگ سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے پاس باریک ڈوری کی ایک ریل تھی۔ وہ ڈوری کا ایک سرا پانی میں ڈبو کر کھیلنے لگی۔

دھندلکے میں جاپان کے جزیرے سوئے ہوئے تھے۔ مجھے یوں ہی خیال آیا کہ میں نے چار ماہ کا طویل عرصہ کوچی کی ایک ہٹ میں بند پڑے پڑے گزار دیا۔ اتنا بھی نہ ہوا کہ وہ اجڑا دیار گھوم پھر کر دیکھ لیتا۔ میں نے راماشی سے کہا۔

"اگر ایک دن کے لیے روانگی ملتوی ہو جائے تو ہم ہیروشیما ہو آئیں"!

اس کی آنکھوں میں دھوئیں کا ایک بادل سا اٹھا اور دیکھتے دیکھتے پھیل گیا۔ اس سے پہلے کہ بادل برستا وہ آنکھیں جھپکا کر بولی۔

"تم نے پاپا کو دیکھا ہی ہے۔ انہی کو ہیروشیما سمجھ لو"!

اور ہوا کے رخ پر کھڑی ہو کر لمبی لمبی سانس لینے لگی۔ اس کی متغیر حالت دیکھ کر مجھے اپنی حماقت پر افسوس ہوا۔ اتنے میں لنگر اٹھایا جانے لگا۔ وہ ڈیک پر گہما گہمی دیکھ کر چونکی۔ اس نے جلدی سے ڈوری کا ایک سرا مجھے پکڑایا اور گینگ وے کی طرف جاتے ہوئے بولی۔

"میرے زخم ابھی بہت گہرے ہیں۔ ذرا مندمل ہو جائیں میں خود ہی تمہارے دیس آ جاؤں گی"!

پھر گینگ وے پر رک کر کہنے لگی۔

"ڈوری چھوڑ نہ دینا۔ میں ساحل پہ کھڑی ڈور چھوڑتی جاؤں گی۔ آنکھوں سے اوجھل ہو کر بھی تھوڑی دیر تعلق قائم رہے گا"!

میں ڈور کا سرا پکڑے رہا۔ وہ ڈوری چھوڑتی رہی۔ رفتہ رفتہ ساحل دور ہوتا گیا اور پھر ——— پھر ساحل نظروں سے اوجھل ہو گیا اور ڈوری میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔

———

اقبال متین

زمین کا درد

جب میں قبرستان میں داخل ہوا تھا اس وقت شام کے دھندلکوں نے اپنی زندگی کی آخری سانسیں رات کے اندھیروں کو سونپ دی تھیں۔ رات دبے پاؤں میرے دل کی اداسیوں کی طرح بڑھ رہی تھی۔ رات کیا چاہتی تھی اس کا مجھے علم نہ تھا۔ میں تو یہ بھی نہ جانتا تھا کہ میری لحظہ لحظہ بڑھتی ہوئی اداسیاں مجھ سے کیا چاہتی ہیں۔ میری جیب میں وہسکی کی آدھی بوتل تھی جو آدھی سے کچھ زیادہ ہی ختم ہو چکی تھی۔ مجھے کبھی کبھی ایسا محسوس ہوا ہے کہ حالات کا زہر پی کر زندگی کے شانہ بشانہ چلنے والا انسان شراب کا سہارا لے کر بھی پچھتاتا ہے۔ آج پھر میں کچھ اسی طرح محسوس کر رہا ہوں۔ وہسکی کی آدھی بوتل نے مجھے مسحور تو کیا ہے لیکن زندگی کے اس زہر کو جو میری نس نس میں سرایت کر گیا ہے، میں بھولنے میں کامیاب نہیں ہو سکا ہوں۔ انسان جس کی مجبوری پہ مجھے ہنسی آتی تھی آج اس کے ہنسنے پر مجھے مجبوری کا گمان ہوتا ہے —— میں سوچتا ہوں زندگی کے اس سفر میں میں اکیلا نہیں ہوں —— کتنے ہوں گے جو اخباروں میں آدمی کے خلا میں تیرنے کی خبر پڑھ کر ان خلاؤں کے متعلق سوچتے ہوں گے جو اسی زمین پر ان کے اطراف پھیلے ہوئے ہیں اور چاند تک پہنچنے والا آدمی ان کا سینہ چیرنے کی دسترس نہیں رکھتا ہے۔

میں جب اپنے ٹیبل پر بیٹھتا ہوں تو اس وقت تک ایک لفظ بھی مجھ سے لکھا نہیں جاتا جب تک کہ شیشے پر اٹی ہوئی گرد کو کپڑے سے صاف نہیں کر لوں —— اور جب میں لکھنا شروع کرتا ہوں تو یہ جان کر بھی مسکرا نہیں سکتا کہ میرے دل پر گرد کی جو تہیں جم گئی ہیں ان کو صاف کر کے اجال دینا میرے ہونٹوں کی کسی مسکراہٹ کے بس میں نہیں ہے۔ میں باہر کی گرد

جھاڑ دیتا ہوں۔ اندر کی گرد کو زادِ راہ سمجھ کر چل پڑتا ہوں۔

میں قبرستان کی ایک ہی جست میں آپ کو اپنی لکھنے کی میز تک لے آیا ہوں۔ لیکن مجھے قبرستان سے لکھنے کی میز تک ایک قدم کا فاصلہ بھی محسوس نہیں ہوا۔ حقیقت کے اس اظہار کو اگر آپ زندگی سے فرار کا نام دیتے ہیں تو مجھے خود پر نہیں آپ پر رحم آتا ہے کہ آپ سچ کو برداشت کرنے کی ہمت نہیں رکھتے۔

چلیے میں پھر آپ کو قبرستان لیے چلتا ہوں۔ میں جس وقت یہاں پہنچا تھا تو میں نے اپنے بیٹے کی قبر کے پائینتی سر جھکا کر بیٹھے بیٹھے پپیہے کی آخری صدا سنی تھی۔ میری آنکھوں اور قبر کے درمیان ٹھیرے ہوئے آنسوؤں کی ایک چلمن سی حائل ہو گئی تھی لیکن اس کے باوجود بھی میں اپنے سینے پہ پھیلے ہوئے سفید بال دیکھ سکتا تھا جو میری شرٹ کا بٹن کھل جانے کی وجہ سے مجھے نظر آ رہے تھے۔ میرا بیٹا قبر میں سو رہا ہے، شام ڈوب رہی ہے پپیہا جانے کس کو پکار رہا ہے اور ایسے میں آنسوؤں کی چلمن سے میں قبر کو دیکھتا ہوں اور اپنے سینے کے سفید بالوں کو بھی —— لیکن کیا آج کی زندگی جینے والوں کے لیے یہ کوئی بہت بڑا سانحہ ہے؟

اگر یہی سب کچھ ہوتا تو مجھ پر وسکی کی آدھی بوتل اتنا اثر نہ کرتی؟ میں اس کی قبر سے چمٹ کر پھوٹ پھوٹ کر نہ رو لیتا؟ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ مجھے اتنے آنسو ملیں کہ انھیں فراخ دلی سے بہا سکوں —— لیکن اتنے آنسو میں کہاں سے لاؤں —— چاند تک پہنچنے والا آدمی اتنا عظیم ہو گیا ہے کہ اس کے پاس آنسوؤں کا ذخیرہ نہیں رہا ہے —— اور میں اپنے اس دور میں پیدا ہونے پہ فخر کرتا ہوں، یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہر جھوٹ حسین ہوتا ہے۔

کہانی شاید اس طرح نہیں بنتی جس طرح میں آپ کو سنانا چاہتا ہوں —— کہانی تو رواں دواں ہوتی ہے۔ جیتے جاگتے آدمی کے سانس کی طرح مسلسل —— بس یوں کہ کہانی شروع ہو اور آپ اس کے ہو رہیں —— میں یہ سارے گر جانتا ہوں۔ لیکن اگر میں آپ کو اکھڑی اکھڑی سانسوں کی کہانی سنانا چاہتا ہوں تو کہانی کے تسلسل کا کیا ہوگا —— پھر بھی میں اکھڑی اکھڑی سانسوں کو جوڑ کر انھیں مسلسل اور مربوط کر کے آپ کو کہانی سنانے کی کوشش کرتا ہوں۔

جب رات نے اپنی سیاہ زلفیں زمین کے شانے پر پھیلا دیں تو زمین کی ساری ہنگامہ آرائیاں چین کی نیند سو گئیں ——— اور یہ تو قبرستان تھا جہاں میں تھا ——— یہاں تو زمین سانس بھی نہیں لیتی کہ کوئی سونے والا جاگ پڑے گا اور اس کے زخم ہرے ہوں گے۔

میں سگریٹ جلا کر اس کی قبر کی پائینتی بیٹھ گیا ہوں۔ جس چہرے پر پھولوں کا سہرا دیکھنے کی تمنا تھی اس کو میں نے منوں مٹی کے نیچے چھپا کر پالش کیے ہوئے پتھر سے ڈھنک دیا ہے اور اب یہی پتھر مجھے پیارے ہیں جن پر میں نے پھول بکھیر دیے ہیں۔ اگربتیاں جلا کر سامنے رکھ دی ہیں اور بیٹھا سگریٹ کے کش لے رہا ہوں۔

تاریکی بڑھنے لگی تو سناٹے اور شدید ہو گئے ——— شہر خموشاں مُردوں کا شہر نہیں ہوتا اگر آپ کو اس شہر کا ایک باسی بھی پیارا ہو۔ اور میں جس کی قبر کی پائینتی بیٹھا ہوں، وہ تو مجھے بہت پیارا تھا ——— میں نے موم بتیاں جلا کر مڈیر کی محرابوں میں رکھ دی ہیں ——— میرے اطراف اجالے پھیل گئے ہیں اور میرے بیٹے کی قبر کی سیدھی جانب دوسری قبروں کے کتبوں کے سائے لمبے ہو گئے ہیں ——— اجالے کے ساتھ ہی یہ سائے کتبوں سے چمٹنے کے لیے چلے آئے ہیں، اندھیرے میں سائے بھی ساتھ نہیں رہتے۔

یہ قبرستان بہت وسیع ہے۔ یوں سمجھیے کہ میں اس کے بیچوں بیچ بیٹھا ہوں ——— میرے اطراف چاروں طرف قبریں بکھری ہوئی ہیں۔ چھوٹی بڑی، نئی پرانی، بہت پرانی ——— میری پشت پر چبوترے کے احاطے کی دیوار سے پرے ایک مکان ہے۔ یہ مکان آہستہ آہستہ منہدم ہو رہا ہے اور ایک بہت بڑی قبر کے مانند لگتا ہے جس میں کئی لوگ زندہ دفن ہیں ——— اس مکان اور محصور چبوترے کے درمیان جس پر میں ہوں آنے جانے کے لیے ——— راستہ چھوڑ کر زمین کا چپہ چپہ استعمال کیا گیا ہے اور جو بچ رہا ہے وہ مرنے والوں کا منتظر ہے۔

روشنی کے اس دھبے نے جو ابھی ابھی موم بتیاں جلانے سے میرے اطراف پھیل گیا ہے میرا سکون چھین لیا ہے۔ میں پھونک مار کر موم بتیاں بجھا دیتا ہوں۔ سچ پوچھیے تو جب میں یہاں ہوتا ہوں تو مجھے ان اجالوں سے ڈر لگتا ہے، اور ڈر مجھے اپنے اطراف بکھری ہوئی موت سے نہیں لگتا بلکہ اس

زندگی سے لگتا ہے جو کھنڈر بنتے ہوئے مکان میں سے مجھے تاکتی ہے ——— میرے بیٹے کی قبر کے اطراف اجالا دیکھ کر اس گھر میں رہنے والے یہ جان جاتے ہیں کہ میں آگیا ہوں ——— پھر اس گھر میں سے ایک ماں نکلتی ہے جو راستہ ڈھونڈھتی ہوئی، قبروں پر پیر رکھتی ہوئی دبے پاؤں محصور احاطے تک پہنچ جاتی ہے جہاں میں اس کی آمد سے بے خبر بیٹھا ہوں۔ وہ بہت آہستہ چھوٹا سا لکڑی کا گیٹ کھول کر بلی کی طرح داخل ہوتی ہے۔ بھیڑ بکریوں کو احاطے میں داخلے سے روکنے کے لیے جو گیٹ بنایا گیا ہے اسی گیٹ سے ہو کر یہ بلّی احاطے میں میرے قریب تک چلی آتی ہے۔ میں اگر قدموں کی چاپ نہیں سن پاتا ہوں اور اس کی طرف پلٹ کر نہیں دیکھتا ہوں تو وہ کچھ دیر کھڑی رہتی ہے۔

پھر مجھ سے کہتی ہے

"اٹھو ——— جس کی امانت تھی اس نے تم سے لے لی۔"

اور میرے دل پہ ایک مکّا سا لگتا ہے۔ میں اس کو ایسی نگاہوں سے دیکھتا ہوں جیسے رحم کی بھیک مانگ رہا ہوں کہ وہ مجھے میری تنہائیاں دے دے۔ مجھے اس جگہ اکیلا چھوڑ دے تاکہ میں جب تک جی چاہے چپ چاپ بیٹھا رہوں۔ پھر چلا جاؤں۔ لیکن کھنڈر ہوتے ہوئے مکان میں رہنے والی نوجوان لڑکیوں کی یہ ماں دراصل ہندوستان بھر کی ماؤں کی روح معلوم ہوتی ہے ——— اور میں محسوس کرتا ہوں کہ میں عالم ارواح میں پہنچ گیا ہوں اور یہ اداس اور ستا ہوا چہرہ جو میرے مقابل ہے دراصل ایک روح ہے۔ ایک ایسی ماں کی روح جس کی چھ لڑکیاں جوان ہیں اور ان جوانیوں کے دفنانے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

مجھ سے دو چار الٹی سیدھی تسلیوں کی باتیں کر کے وہ اپنی رام کہانی لے بیٹھتی ہے۔ بیچ بیچ میں مجھے نصیحت بھی کرتی جاتی ہے کہ میں غم نہ کروں ——— یوں کرنا شاید اس لیے وہ ضروری سمجھتی ہے کہ مجھے احساس دلاتی رہے کہ اس کے دل میں میرے لیے ہمدردی ہے حالانکہ وہ خود ہمدردیاں بٹورنے چلی آئی ہے۔

"بی جان کا زردوزی کا ددپٹہ پرسوں میں نے اونے پونے بیچ دیا۔ اس کی شادی کے لیے کب سے اٹھا رکھا تھا۔ اس مہنگائی کی کوئی حد بھی ہے۔ چوراسی پیسے کیلو موٹے چاول ملتے ہیں اور

وہ بھی کس طرح جب میں نے دکاندار کے پیر پکڑ لیے ——— اچھی سرکار ہے۔ چاول بیچنے پر پابندی لگاتی ہے اور جس دوکان سے چاول حاصل کرنے کے لیے کارڈ جاری کرتی ہے وہاں نہ چاول کا دانہ ہے نہ گیہوں کا ——— شکر تو آنکھوں کا سرمہ ہوگئی ہے۔ پلکوں سے اٹھانا چاہو تب بھی نہیں ملتی ——— دو روز میں نے ہوٹل سے روٹیاں منگوائی ہیں۔ تب کہیں ذرا سا اُدھار ہوا ہے۔ اس وقت کے پیٹ کے بھنو میں تو دو روز کا راشن آسکتا ہے ——— چائے بغیر تو میں جی نہ سکتی تھی لیکن جی رہی ہوں ——— اب تو چائے کا مجھے خیال بھی نہیں آتا ——— چھ پہاڑ سینے پہ دھرے ہیں ——— انھیں بھوکوں مارنا مجھ سے ممکن ہوتا تو میں بھی کسی قبر میں چین کی نیند سو جاتی۔ جینے میں مزہ نہیں اذیت ہے لیکن یہ اذیت میں انھیں لونڈیوں کے لیے برداشت کرتی ہوں ورنہ زندگی سے جی اوب گیا ہے میاں۔ یہ لوگ اچھے ہیں جو چین کی نیند سو رہے ہیں ——— وہ قبروں کی طرف بتلا کر کہتی ——— میں چاہتا کہ وہ اب ٹل جائے لیکن وہ پھر کہنے لگتی ——— کبھی کبھی جی چاہتا ہے کہ تیل چھڑک کر سب کو جلا ڈالوں اور خود بھی جل مروں۔ کتنے ہی خاندان تنگ آکر جب ایسا کچھ کرتے ہیں تو ان کی بے دردی پر الجھن ہوتی ہے ——— سوچتی ہوں ان کے سینوں میں دل نہیں پتھر ہوں گے لیکن دو روز زندہ رہنے کی کوشش میں گزرتے ہیں تو اپنی ہی مجبوریاں ہم سے کہتی ہیں کہ پتھر تو تمھارے سینوں میں ہیں جو ایسی زندگی جی رہے ہو۔"

میں اس کی بکو اس سے تنگ آگیا ہوں ——— اوٹ پٹانگ بہت سی باتیں سوجھ رہی ہیں۔ مجھے اپنی تنہائی کے لٹنے کا غم ہے اور یہ عالم ارواح کی ماں جو قبروں پہ پاؤں رکھ کر دبے دبے میرے پیچھے چلی آئی ہے اپنے سینے پر سے چھ پہاڑوں کا بوجھ تیل اور آگ کے سہارے اتار دینے کی سوچ رہی ہے۔

"اور پھر جل مرنا بھی تو آسان نہیں" ——— وہ پھر شروع ہوگئی ہے ——— "مٹی کا تیل چوالیس پیسے شیشہ ہوگیا ہے۔ اس طرح مرنا تو بہت مہنگا پڑے گا۔"

میں اٹھتا ہوں اور اس سے چھٹکارا پانے کے لیے نکل جاتا ہوں۔ آداب سلام کے بعد میں اس کو اتنا وقت بھی نہیں دیتا کہ وہ پھر کچھ مجھ سے کہہ سکے۔

اس وقت تو وہ میرے پاس نہیں ہے۔ اس وقت تو میں اکیلا ہوں لیکن میں ڈر رہا ہوں کہ کہیں وہ آ نہ جائے ـــــ روشنی کے اس دھبے نے جو ابھی موم بتیاں جلانے سے میرے اطراف پھیل گیا ہے۔ میرا سکون چھین لیا ہے۔ میں پھونک مار کر موم بتیاں بجھا دیتا ہوں۔

روشنی کے یکایک غائب ہو جانے سے اندھیرے زیادہ گہرے ہو گئے ہیں لیکن آنکھیں دیکھتے ہی دیکھتے ان اندھیروں سے مانوس ہو گئی ہیں اور اب میں اپنے سامنے گنبد کا ہرا دروازہ ہمیشہ کی طرح دیکھ سکتا ہوں۔ اس گنبد میں میرے جدِ امجد یا پھر شاید ان کے بھی جدِ امجد سو رہے ہیں۔ میں نے صحیح رشتہ جاننے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ یہ لوگ وہ ہیں جنھوں نے علم کے دریا بہائے ہیں۔ انسانوں کے انبوہ نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی ہے ان سے عرفان و آگہی حاصل کی ہے۔ بہرحال میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ یہ ایسی ہستیاں ہیں جن کے اعمال و اوصاف پر جا ہوں تو میں کبھی فخر کر سکتا ہوں جس طرح ماؤں کی وہ پیاسی روح کرتی ہے جو کھنڈر ہوتے ہوئے بنگلے سے نکل کر دبے پاؤں میرے پیچھے موم بتی کی روشنی کا دھبا دیکھ کر چلی آتی ہے۔ یہ عورت میری رشتہ دار ہے اور گنبد میں سونے والی ان برگزیدہ ہستیوں سے اس کا رشتہ زیادہ قریبی ہے۔

مجھے اندھیرے میں چپ چاپ کھڑی ہوئی اس گنبد کو دیکھ کر اپنا بچپن یاد آیا۔ میری نانی امی یہاں گنبد کے باہر پیش دالانوں میں رہتی تھیں اور نانا ابا احاطے کی آخری نکڑ پر نقار خانے میں رہتے تھے جیسے طوطی کی آواز بن گئے ہوں ـــــ عید بقر عید میں ہم ملنے کے لیے آتے تو خاندان کے اکثر بچوں کے ساتھ مل جل کر ایک اچھی خاصی فوج تیار ہو جاتی۔ فوج گنبد کے دروازے پر یلغار کرتی تو گنبد کے دروازے کھول دیے جاتے اور ہم سب کے سب ادب سے اندر داخل ہوتے ـــــ بزرگوں میں جو بھی رشتہ دار خاتون ساتھ ہوتیں عود دان سے اٹھا کر سوکھی ہوئی گلاب کی پتیاں تبرکاً کھلا دیتیں ـــــ پھر بلا جلا کورس شروع ہوتا اور وہ کورس نثر کے ایک مہمل جملے کو لحن میں ادا کرنے سے زیادہ آگے نہ بڑھتا۔ لیکن کئی کئی منٹ تک خشوع و خضوع کا یہ سلسلہ جاری رہتا۔

"نانا حضت پیسے دلاؤ۔"

یہ چار لفظ ترنم میں الفاظ توڑ اور کھینچ کر ادا کیے جاتے۔

پتہ نہیں گنبد کے ساتھ بھیک مانگنے کی رسم کیوں وابستہ ہوگئی ہے۔ یہ بھی یاد نہیں کہ کس نے ہمیں یہ کورس یاد دلایا تھا۔ آج سوچتا ہوں تو صرف اتنا سمجھ میں آتا ہے کہ ہمارے اچھے دنوں پر برے دنوں کی پرچھائیاں اسی زمانے میں پڑنے لگی ہوں گی کہ ماؤں نے نانا سے علم مانگنے کے لیے نہیں کہا، پیسہ مانگنے کے لیے اکسایا۔

نانا حضرت نے کسی کو کچھ دیا ہو کہ نہ دیا ہو اس پیاسی روح کو جو موم بتی کے اجالے کی روشنی کو دور سے دیکھ کر قبروں سے ٹھوکریں کھاتی نکل پڑتی ہے اتنا دے دیں کہ وہ چھ پہاڑوں کا بوجھ بغیر زردوزی کا دوپٹہ بیچے سہار سکے تو غنیمت ہے۔ اس لیے کہ یہ پیاسی روح نانا حضرت پر سب سے زیادہ حق رکھتی ہے، کیونکہ وہ ان کی درگاہ کے سجادے کی بیوی ہے اور یہ سجادہ ان کا پوترا، پڑپوترا، سگڑپوترا کچھ تو ہے۔

اب میری آنکھیں اندھیروں سے اتنی مانوس ہوگئی ہیں کہ دور تک دیکھ سکتی ہیں۔ لیکن یہاں دیکھنے کے لیے کچھ ہے ہی نہیں جہاں تک میں دیکھ سکتا ہوں قبریں ہی قبریں ہیں۔ جہاں میں نہیں دیکھ سکتا ہوں وہاں بھی قبریں ہیں جو دن کے اجالے میں مجھے نظر آتی تھیں اور اب آنکھوں سے اوجھل ہیں پاس ہی بوڑھے املی کے درخت کے نیچے ایک جگنو بھٹک رہا ہے۔ کوئی مسافر یہاں ہوتا تو اس جگنو کی روشنی میں بھی راستہ پانے کی سوچ سکتا تھا لیکن یہاں تو سارے مسافر تھک کر سو گئے ہیں اور ایسا سوئے ہیں کہ انھیں نہ سورج کی کرنیں جگا سکتی ہیں نہ بارش کی بوندیں۔ ایسے میں یہاں اس جگنو کا وجود بالکل فضول معلوم ہوتا ہے۔

کسی قبر پر کوئی چراغ نہیں ہے۔ چراغ خود بخود بھی تو نہیں جلتے۔ اب زندگی کو اتنی فرصت بھی کہاں ہے کہ موت کے راستوں میں چراغاں کرتی پھرے۔

میں خود بھی، تو مہینوں کے بعد یہاں آیا ہوں، جس شخص کا چہرہ دن میں دس بار دیکھے بغیر چین نہ پڑتا تھا اس کی قبر کی طرف مہینوں تک میں نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا ہے ——— یہ سوچ کر جی کتنا اداس ہو جاتا ہے کہ کل ہم بھی ذہنوں سے حرفِ غلط کی طرح محو ہو جائیں گے ———

اس سے پہلے جب اپنے معمول کے مطابق میں پندرہ بیس دن کی تاخیر سے قبرستان گو گیا تھا تو مجھ سے اسی پاگل ماں کی روح نے کہا تھا۔

"اس وقت تم یہاں کیسے آسکتے ہو اس وقت تو تمھیں غلے کے لیے کیو میں ہونا چاہیے تھا"

اور اس سے پہلے کہ میں اسے کچھ کہتا ـــــ اس نے خود جواب گڑھ دیا تھا۔

"تم اسی لیے اتنے دن نہیں آئے ہو ـــــ کیوں ہے نا؟"

جب یہ باتیں ہوئی تھیں اس وقت اندھیرے کبھی نہیں تھے جو مجھے چھپا لیتے ـــــ سورج ابھی نکلا نہ تھا۔ نکلنے کے لیے سنور رہا تھا ـــــ وہ اطمینان سے میرے پیچھے احاطے کی دیوار تک چلی آئی تھی۔

آج مہینوں کے بعد میں جب یہاں آیا ہوں تو میں نے خود ہی جلائی ہوئی موم بتیاں پھونک مار کر بجھا دی ہیں کہ کہیں وہ پیاسی روح دبے پاؤں چلی نہ آئے لیکن اس وقت جب موم بتیوں کے شعلے لرز کر بجھنے ہی والے تھے، میں نے اپنے بیٹے کی قبر پر تازہ پھول دیکھے تھے ـــــ مجھے کوئی اچنبھا نہیں ہوا تھا۔ دراصل یہ میری بھول تھی ـــــ میں تو یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ میں نے ہی پھول چڑھائے ہیں۔ لیکن جب میری آنکھیں اندھیروں سے مانوس ہوئیں اور جب میں نے گنبد کے ہرے دروازے کو بند دیکھا تو اس دروازے کی دراز سے مجھے اپنا سرکش بچپن جھانکتا ہوا دکھائی دیا جو نانا حضرت سے پیسہ مانگنے کی اہانت کو زیادہ دنوں تک برداشت نہ کر سکا تھا ـــــ اور جب ان یادوں کو گنبد کی تاریکیوں میں پھینک کر میرا ذہن اپنے بیٹے کی قبر پر واپس آیا تو میں نے سگریٹ جلانے کے لیے کتبے کی اوٹ میں چھپ کر اس احتیاط سے تیلی جلائی کہ لمحہ بھر کو پھیلنے والی یہ روشنی بھی کھنڈر ہوتے ہوئے مکان میں رہنے والی پگلی ماں کی نظروں سے چھپی رہے ـــــ لیکن میری آنکھوں نے ایک عجیب چیز دیکھ لی۔ مجھے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ ہوا ـــــ میں نے چھو کر دیکھا۔ میں جو کچھ دیکھ رہا تھا سچ تھا ـــــ وہ کون ہے، وہ کون ہے جو میرے غم میں شریک ہو گیا ہے ـــــ وہ پھول جو میں نے قبر پر چڑھانے کے لیے لیے تھے وہ تو پیپل کے بھیگے ہوئے ہرے پتوں میں محفوظ تھے۔ ان پر لپٹا ہوا کچا دھاگا تک جوں کا توں تھا ـــــ پھر یہ تازہ پھول کس نے

میرے بیٹے کی قبر پر چڑھا دیے تھے ـــــــ میں نے پھول اٹھا کر اپنی آنکھوں سے بالکل قریب کر لیے ـــــــ میری انگلیوں کی پوروں نے پھولوں کی نمی اور ٹھنڈک محسوس کی۔

ہمیں سورج کی کرنوں نے نہیں چھوا ہے ـــــــ نرم پھول میری بھیگی ہوئی پلکوں سے کہہ رہے تھے ـــــــ میں نے انھیں قبر پر اس احتیاط سے رکھ دیا جیسے پلکوں میں آنسو پرو رہا ہوں۔

جی چاہا موم بتیاں جلا کر اس پگلی ماں کا انتظار کروں جو روح کی طرح قدموں کی کسی چاپ کے بغیر میرے پیچھے چلی آتی ہے ـــــــ میں نے مزید کچھ سوچے بغیر موم بتیاں جلا دیں ـــــــ تازہ پھولوں نے میرے بیٹے کی قبر کے پالش کیے ہوئے پتھروں پر اپنی نمی کے نقش چھوڑے ہیں۔ میں نے انھیں چومنا چاہا تو میرا سایہ قبر پر ڈول گیا ـــــــ پھر میں نے خود کو سنبھال لیا ـــــــ وہسکی کی بوتل سے کڑوے سے گھونٹ لیے۔ پھر سگریٹ کے لمبے لمبے کش لے کر اس طرح چپکا سا بیٹھ رہا جیسے قبروں سے سانسوں کی آواز سن رہا ہوں۔

پاس کے اجالے نے دور کے اندھیرے کو اور بھی گہرا کر دیا تھا۔ نیم کے بوڑھے درخت کی بلندی کو اب ایک نہیں کئی جگنو چھو رہے تھے۔ یہاں اگر جگنوؤں کا کھیت بھی بچھا دیا جائے تو بے فائدہ ہے ـــــــ یہاں جگنو کی چمک، موم بتی کے اجالے، قمقموں کی بجلی کچھ بھی تو دلوں کے اندھیروں کو دور رکھنے کی اہمیت نہیں رکھتے۔

مجھے محسوس ہوا کہ کوئی میرے پیچھے آ کر کھڑا ہو گیا ہے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا، کوئی نہیں ہے۔ لیکن وہ کون ہے ـــــــ وہ ـــــــ بوڑھے نیم کے گھنے اندھیرے میں ـــــــ میں کھڑا ہو گیا ہوں۔ میں نے بغور دیکھا ہے۔ یقیناً کوئی ہے۔

میں آہستہ آہستہ احاطے سے باہر نکل آیا ہوں۔ میں نے پلٹ کر اپنے بیٹے کی قبر پہ نظر ڈالی ـــــــ موم بتیوں کی روشنی میں بھی میں اس کے کتبے پر کندہ اس کا نام، اسکی تاریخ پیدائش، اس کی تاریخ وفات کچھ بھی نہیں پڑھ سکتا ہوں اس لیے کہ اس عبارت کی سیاہی اکھڑ گئی ہے ـــــــ میں کچھ اور دکھی ہو گیا ہوں۔ کسی کتبے کے حروف مٹ رہے ہوں تو سمجھو کہ اس کے رونے والے کے دل سے اسکی یاد مٹ رہی ہے۔

میں سر جھکائے احاطے کی دیوار سے لگا ہوا پیر دبا کر بوڑھے املی کے درخت کی جانب چل رہا ہوں ـــــ اب یہاں سے دور تک شکستہ قبروں کا سلسلہ ہے۔ ایسی قبروں کا سلسلہ جن کے رونے والے کوئی نہیں رہے ہیں ـــــ میں چلتا چلتا ٹھہر جاتا ہوں ـــــ مجھے یہ دیکھ کر یہ جان کر تکلیف سی ہوتی ہے کہ میں جسے ناہموار زمین سمجھ رہا ہوں وہ دراصل کوئی قبر ہے ایسی قبر جسے پہچاننے والا بھی کوئی نہیں ہوگا ـــــ ایک خیال میرے ذہن سے تیر کی طرح سنسناتا ہوا گزرتا ہے ـــــ کیا یوں بھی ہوگا کہ کبھی کوئی میرے بیٹے کی قبر سے اسی طرح گزرتا ہوا لمحہ بھر کو رک کر کچھ سوچے گا۔ ـــــ نہیں ـــــ ایسا نہیں ہوگا۔ کبھی نہیں ہوگا ـــــ لیکن اس کا کتبہ جیسے میرے سینے پر آ لگا ہے ـــــ مجھے پڑھو ـــــ تمہارے جیتے جی میری یہ حالت ہے ـــــ میرے حروف مٹ رہے ہیں ـــــ تمہارے زخم بھر رہے ہیں ـــــ آؤ ان حروف کو پھر سے بھر کر اپنے زخم ہرے کر لو۔

میں ناہموار شکستہ قبر پر سے اتر کر اس طرح چل رہا ہوں جیسے پیر زمین پر رکھنا ہی نہیں چاہتا ہوں ـــــ اب میں بوڑھے املی کے پیڑ کے بالکل پاس پہنچ گیا ہوں ـــــ خورد و جنگلی جھاڑیوں کے ایک جھنڈ نے میری نظروں کو آگے بڑھنے سے روک کر اپنے ہی میں الجھا رکھا ہے ـــــ میں گھوم کر جھنڈ کے اس سمت پہنچتا ہوں جو نیم کے بالکل نیچے ہے۔ میں ٹھٹھک کر رہ گیا ہوں۔ تازہ قبر کے پاس ایک عورت بیٹھی ہوئی ہے ـــــ پتیوں کی کھڑکھڑاہٹ پر اس نے پلٹ کر دیکھا لیکن وہ مجھے نہ دیکھ سکی۔ میں نے اس کو پہچان لیا ہے ـــــ یہ وہی روح ہے جس کا موم بتیاں جلا کر میں نے اپنے بیٹے کی قبر پر انتظار کیا ہے ـــــ لیکن روشنی کے دھبّوں کی جانب بے تحاشہ بڑھنے والی یہ روح آج اس تازہ قبر پر اندھیروں کی ہو کر رہ گئی ہے۔

"کس کی قبر ہے یہ؟"

میں نے اس سوال سے پہلے کسی اور سوال کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

اس نے پلٹ کر مجھے دیکھا۔

"تم کون ہو؟"

میں اسے دیکھتا رہ گیا ——— وہ بھی مجھے دیکھ رہی تھی ——— پھر وہ ہنسی، اس کی ہنسی سے مجھے وحشت سی ہوئی۔

"اٹھو، جس کی امانت تھی اس نے تم سے واپس لے لی ہے" ——— میں نے دل مضبوط کرکے یہ جملہ کہہ دیا۔

اس نے آنکھیں جھپکا جھپکا کر مجھے دیکھا ——— پھر اٹھ کھڑی ہوئی ——— "میری بی جان کی قبر ہے یہ ——— اس نے خودکشی کر لی ہے؟" ———

"وہ سنو ——— سنتے ہو ——— بی جان کا بچہ رو رہا ہے؟"

"بی جان کا بچہ؟"

اس نے اثبات میں صرف گردن ہلائی

میں سب کچھ سمجھ گیا اور اس کا منہ تکتا رہا ——— بھلا میں اس سے یہ پوچھ کر بھی کیا کرتا کہ بی جان کا عقد اسی سے کر دیتیں جس کا یہ بچہ ہے۔

اور پھر اس نے مجھے بات کرنے کی مہلت بھی تو نہیں دی تھی۔

ٹوٹی ہوئی قبروں پہ پیر رکھتی ہوئی وہ اپنے کھنڈر ہوتے ہوئے مکان کی طرف تیز تیز چلی جا رہی تھی اور کھنڈر سے کسی نومولود بچے کے بلک بلک کر رونے کی آواز میں صاف سن رہا تھا۔

اپنے بیٹے کی قبر پر لوٹتے وقت میں نے اس قبر کو نہ روندنے کے خیال سے، جس کی شکستگی نے میرا دل ہلا دیا تھا جانے کتنی قبریں روند ڈالیں، جو سرے سے مٹ چکی تھیں۔

ہوا کے کسی آوارہ جھونکے نے میرے بیٹے کی قبر کا دیا بجھا دیا ہے لیکن جب میں اس کی تربت کے پائینتی پہنچا ہوں تو درختوں کے جھنڈ میں چھپا ہوا چاند اب اتنا ابھر گیا ہے کہ میں اس کا چہرہ دیکھ سکتا ہوں اور ہلکی مدھم چاندنی سارے بین بکھر کر ٹوٹ ٹوٹ گئی ہے۔

——— میں نے بوتل منہ سے لگا کر دو گھونٹ حلق سے نیچے اتار لیے ہیں

——— میں نے کھنڈر سے آتی ہوئی نومولود بچے کے رونے کی آواز پھر سنی ہے۔

——— میں نے اپنے بیٹے کی قبر پہ تازہ پھولوں کو پھر دیکھا اور یہ سوچا بھی نہیں کہ کس نے

چڑھائے ہیں۔
______ میں نے پھولوں کا دونا کھول کر وہ پھول بھی قبر پر چڑھا دیے ہیں جو میں اسی لیے لایا ہوں۔
______ میں نے سگریٹ جلا کر چاند کو دیکھا ______ وہ اب درختوں سے بلند ہو کر بادل کی اوٹ میں چھپ رہا ہے۔
مجھے محسوس ہوا جیسے چاند مجھ سے پوچھ رہا ہے کہ تم لوگ مجھ تک پہنچ بھی جاؤ تو اس زمین کے درد کو زمین ہی پر چھوڑ آؤ گے نا۔ میرے سینے میں اتنی وسعت کہاں ہے جو زمین کا سارا دکھ درد سمیٹ سکوں۔

اور چاند نے بادل کی چادر تان لی۔
میں ہر چادر کو کفن تو نہیں کہہ سکتا۔

غیاث احمد گدّی

ڈورتھی جون سین

"پورا نام کیا لکھوں — ڈورتھی لامار؟"

دبلے پتلے بنگالی جیولر کی آنکھیں عینک کے دبیز شیشوں کے پیچھے طنز سے سکرائیں اور وہ اینگلو انڈین لڑکی جو اپنے سونے کا ہار جیولر کو دے چکنے کے بعد سوچ کے سمندر میں ڈوبی ہوئی تھی اور جس کے بال ریشمی نہیں تھے اور جس کے فراک کے اڑے ہوئے رنگ نے بنگالی جیولر کو اس قدر گہرا طنز کرنے پر آمادہ کر دیا تھا، چونک اٹھی — جیسے اسے کسی نے ایک موٹی سی گالی جڑ دی ہو — ہوا میں اڑتے ہوئے بھورے بادلوں کی لٹ کو بکھیرتے ہوئے کہا:۔

"نہیں — ڈورتھی جون سین — لامار ہوتی تو ہندوستان کے ایک معمولی سے شہر کی ذلیل سی دکان میں اپنا زیور بیچنے نہ آتی — اور نہ ہی —" وہ بولتے بولتے اچانک خاموش ہوگئی۔ سفید کاغذ پر دوڑتی ہوئی فاؤنٹین پین کی سنہری نب کو دیکھنے لگی، جو ننھے ننھے خوبصورت حروف بناتی بڑی تیزی سے اپنے پیچھے سیاہ نقش پا چھوڑتی ہوئی چلی جارہی تھی۔

"اس پر دستخط کر دیجئے میڈیم —!" بنگالی جیولر نے کہا۔

تیزی سے دوڑتی ہوئی نب کب رکی، اسے اس کا خیال بھی نہ رہا۔ اچانک بڑے سے سفید موٹی کھاتے کی تحریر پر اس نے ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ اور جلدی سے جیولر کی بتائی ہوئی جگہ پر دستخط

کر دیئے۔ ایک سو دس روپے کے نوٹ سنبھالتی ہوئی وہ سائیکل کے اگلے پہیے کو دباکر ہوا دیکھ رہی تھی کہ پھر بنگالی جیولر کی آواز نے اس کے کانوں میں پگھلتا ہوا سیسہ انڈیل دیا۔

"اور روپے کی ضرورت آپڑے تو بے تکلف آجائیے گا میڈم! زیور نہ بھی ہو تو کوئی حرج نہیں صرف آپ کا ہونا کافی ہے!"

اس کے جی میں آئی کہ تمام نوٹ چاک کر کے کمینے جیولر کے منہ پر دے مارے اور چیخ چیخ کر رونے لگے۔ لیکن وہ ایسا نہ کر سکی۔ دوسرے لمحے ہی اسکے تحت الشعور پر جون کھانستا ہوا بے بسی کی حالت میں نمودار ہوا! اور وہ چپ چاپ گھر کی طرف جانے والی سنسان سڑک پر ہولی۔

ڈورتھی جانتی تھی کہ جیولر صرف جیولر ہی نہیں بلکہ دلال بھی ہے اور لڑکیوں کو پھانس کر وہ شہر کے کارخانہ داروں، مل مالکوں اور رئیس آفیسروں کے سپرد کرتا رہتا ہے اور اس طرح وہ کافی روپے کما لیتا ہے۔ انگلو انڈین لڑکیوں کی تو وہ ٹوہ میں رہتا ہے، جسے خریدار خاص طور پر پسند کرتے ہیں۔ اس طرح دوسری لڑکیوں کے مقابلے میں اسے زیادہ دلالی مل جاتی ہے اور اس نے یہ سب کچھ جانتے ہوئے اسی جیولر کے پاس جانا مناسب سمجھا تھا۔ یہ جیولر شہر کے کچھ کنارے رہتا تھا۔ اس نے سوچا زیور بیچتے ہوئے اسے کوئی جانا پہچانا ہوا آدمی دیکھ نہ پائیگا اور اگر اپنا آپ ٹھیک ہو تو کوئی کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ جیولر کو اتنی جرأت ہی نہ ہوگی کہ وہ کسی شریف خاتون کو آوارگی کی دعوت دے سکے۔ وہ عورتیں تو آپ ہی جیولر کے پاس اس غرض سے آتی ہیں جو کمینی ہیں۔ جنھیں گناہ نے کچھ اس قدر ملوث کر دیا ہے کہ وہ چند روپے یا ایک لمحاتی عیش کے لئے اپنی عصمت تک بیچ ڈالتی ہیں۔ اور یوں وہ ذلّت کا سامان آپ پیدا کرتی ہیں۔ انسانیت کے اعلیٰ ترین جوہر کو تباہ کر دیتی ہیں۔ وہ تو شریف

کو کیسے جرأت ہو سکتی ہے۔

لیکن بنگالی جیولر اپنی کمینگی سے باز نہ آیا۔ اس نے ڈورتھی کو بھی گناہ کی دعوت دیتے ہوئے جھجک محسوس نہ کی۔ اور آج وہ بنگالی جیولر کی اچھالی ہوئی کیچڑ کو اپنے دامن پر صاف دیکھ رہی تھی — ڈورتھی سوچتے سوچتے پھر اپنے خیالوں کی گہرائیوں میں ڈوب سی گئی۔ سائیکل دوریہ درختوں

اور مکانوں کے بیچوں بیچ گذرنے والی اکیلی اور بیوہ کی چھاتی کی طرح ویران رہنے والی سڑک پر آہستہ آہستہ رینگ رہی تھی۔ سیاہی مائل سبز درختوں کی قطار پیچھے کھسکتی جا رہی تھی۔ سائیکل پر بیٹھے بیٹھے ڈورتھی نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ سڑک کا بایاں موڑ قریب تھا۔ جہاں سے اسے اپنے گھر کی طرف جانے والی سڑک ملتی تھی۔ سرخ اینٹوں والا گرجا اسکے سامنے تھا۔ گرجا کی عین پیشانی پر کندہ تھا "یسوع نے کہا۔ اُٹھ — اور لڑکی اٹھ کھڑی ہوئی —!!" ڈورتھی نے سوچا، کاش اسے کہیں خداوند یسوع مل جاتا۔ اس وقت وہ اپنا سر پورے خلوص سے اسکے قدموں پر ڈال کر کہتی —" اے مردہ لڑکی کو زندہ کرنے والے مقدس خدا۔ تجھ سے ایک بے بس اور لاچار لڑکی دعا کر رہی ہے کہ تجھے تیری ماں ورجن میری کی عصمت کی قسم کہ میری عصمت کی موت سے پہلے خود مجھے موت آجائے، مجھے اس جہاں سے اٹھائے، اپنے پاس عرش کی بلندی پر، جہاں پہونچ کر کوئی بنگالی جیولر مجھ پر کیچڑ نہ اچھال سکے۔"

گرجا فرلانگ بھر پیچھے رہ گیا تھا۔ اس کی سائیکل اکیلی سڑک پر مونگ دلتی جا رہی تھی۔ اور ڈورتھی کو یسوع کہیں نہ مل سکا۔

جب وہ اپنے کمرے کے قریب آئی تو اندر سے جون کے کھانسنے کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ وہ جلدی سے سائیکل کو دروازہ والے زینے سے لگا کر اندر لپکی۔ لیکن اتنی دیر میں جون کی کھانسی بند ہو چکی تھی اور وہ تکیئے کے سہارے نیم دراز کھلی ہوئی کھڑکی سے باہر کی جانب دیکھ رہا تھا اور آہستہ آہستہ تولیئے سے پیشانی پر آئے ہوئے پسینے کو خشک کئے جا رہا تھا، جیسے میلوں کی مسافت طے کر لینے کے بعد وہ بالکل نڈھال ہو گیا ہو۔ ڈورتھی خلاف توقع جون کا چہرہ اترا ہوا دیکھا۔ جون کے کانوں میں جب ڈورتھی کے قدموں کی چاپ گئی تو اس نے گردن گھما کر کہا۔

"ڈورتھی ڈارلنگ میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا —!"

"کیوں —؟ کیسی طبیعت ہے تمہاری —؟" ڈورتھی سامنے والے اسٹول کو پلنگ کے قریب کھینچ کر بیٹھ گئی۔ اور جون کے ہاتھ سے تولیہ لے کر اسکے پسینے خود پونچھنے لگی۔

"کچھ نہیں ڈورتھی، آج ذرا کھانسی آگئی ہے — شاید خون بھی آیا ہے!"

کر دیئے - ایک سو دس روپے کے نوٹ سنبھالتی ہوئی وہ سائیکل کے اگلے پہیے کو دباکر ہوا دیکھ رہی تھی کہ پھر بنگالی جیولر کی آواز نے اس کے کانوں میں پگھلتا ہوا سیسہ انڈیل دیا۔

"اور روپے کی ضرورت آپڑے تو بے تکلف آجائیے گا میڈم! زیور نہ بھی ہو تو کوئی حرج نہیں صرف آپ کا ہونا کافی ہے!"

اس کے جی میں آئی کہ تمام نوٹ چاک کر کے کمینے جیولر کے منہ پر دے مارے، اور چیخ چیخ کر رونے لگے۔ لیکن وہ ایسا نہ کر سکی۔ دوسرے لمحے ہی اسکے تحت الشعور پر جون کھانستا ہوا بے بسی کی حالت میں نمودار ہوا! اور وہ چپ چاپ گھر کی طرف جانے والی سنسان سڑک پہ ہولی۔

ڈورتھی جانتی تھی کہ جیولر صرف جیولر ہی نہیں بلکہ دلال بھی ہے اور لڑکیوں کو پھانس کر وہ شہر کے کارخانہ داروں، مل مالکوں اور رئیس آفیسروں کے سپرد کرتا رہتا ہے اور اس طرح وہ کافی روپے کما لیتا ہے۔ انگلو انڈین لڑکیوں کی تو وہ ٹوہ میں رہتا ہے، جسے خریدار خاص طور پر پسند کرتے ہیں۔ اس طرح دوسری لڑکیوں کے مقابلے میں اسے زیادہ دلالی مل جاتی ہے اور اس نے یہ سب کچھ جانتے ہوئے اسی جیولر کے پاس جانا مناسب سمجھا تھا۔ یہ جیولر شہر کے کچھ کنارے رہتا تھا۔ اس نے سوچا زیور بیچتے ہوئے اسے کوئی جانا پہچانا ہوا آدمی دیکھ نہ پائیگا اور اگر اپنا آپ ٹھیک ہو تو کوئی کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ جیولر کو اتنی جرأت ہی نہ ہوگی کہ وہ کسی شریف خاتون کو آوارگی کی دعوت دے سکے۔ وہ عورتیں تو آپ ہی جیولر کے پاس اس غرض سے آتی ہیں جو کمینی ہیں۔ جنھیں گناہ نے کچھ اس قدر ملوث کر دیا ہے کہ وہ چند روپے یا ایک لمحاتی عیش کے لئے اپنی عصمت تک بیچ ڈالتی ہیں۔ اور یوں وہ ذلت کا سامان آپ پیدا کرتی ہیں۔ انسانیت کے اعلیٰ ترین جوہر کو تباہ کر دیتی ہیں۔ وہ تو شریف ..... کو کیسے جرأت ہو سکتی ہے۔

لیکن بنگالی جیولر اپنی کمینگی سے باز نہ آیا۔ اس نے ڈورتھی کو بھی گناہ کی دعوت دیتے ہوئے جھجک محسوس نہ کی۔ اور آج وہ بنگالی جیولر کی اچھالی ہوئی کیچڑ کو اپنے دامن پر صاف دیکھ رہی تھی ــــ ڈورتھی سوچتے سوچتے پھر اپنے خیالوں کی گہرائیوں میں ڈوب سی گئی۔ سائیکل دو رویہ درختوں

اور مکانوں کے بیچوں بیچ گذرنے والی اکیلی اور بیوہ کی چھاتی کی طرح ویران رہنے والی سڑک پر آہستہ آہستہ رینگ رہی تھی۔ سیاہی مائل سبز درختوں کی قطار پیچھے کھسکتی جا رہی تھی۔ سائیکل پر بیٹھے بیٹھے ڈورتھی نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ سڑک کا بایاں موڑ قریب تھا۔ جہاں سے اسے اپنے گھر کی طرف جانے والی سڑک ملتی تھی۔ سرخ اینٹوں والا گرجا اسکے سامنے تھا۔ گرجا کی عین پیشانی پر کندہ تھا "یسوع نے کہا۔ اُٹھ ـــ اور لڑکی اٹھ کھڑی ہوئی ـــ!" ڈورتھی نے سوچا، کاش اسے کہیں خداوند یسوع مل جاتا۔ اس وقت وہ اپنا سر پورے خلوص سے اسکے قدموں پر ڈال کر کہتی ـــ " اے مردہ لڑکی کو زندہ کرنے والے مقدس خدا۔ تجھ سے ایک بے بس اور لاچار لڑکی دعا کر رہی ہے کہ تجھے تیری ماں ورجن میری کی عصمت کی قسم کہ میری عصمت کی موت سے پہلے خود مجھے موت آجائے، مجھے اس جہاں سے اٹھا لے، اپنے پاس عرش کی بلندی پر، جہاں پہونچ کر کوئی بنگالی جیولر مجھ پر کیچڑ نہ اچھال سکے۔"

گرجا فرلانگ بھر پیچھے رہ گیا تھا۔ اس کی سائیکل اکیلی سڑک پر مونگ دلتی جا رہی تھی۔ اور ڈورتھی کو یسوع کہیں نہ مل سکا۔

جب وہ اپنے کمرے کے قریب آئی تو اندر سے جون کے کھانسنے کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ وہ جلدی سے سائیکل کو دروازہ والے زینے سے لگا کر اندر لپکی۔ لیکن اتنی دیر میں جون کی کھانسی بند ہو چکی تھی اور وہ تکیے کے سہارے نیم دراز کھلی ہوئی کھڑکی سے باہر کی جانب دیکھ رہا تھا اور آہستہ آہستہ تولئے سے پیشانی پر آئے ہوئے پسینے کو خشک کئے جا رہا تھا، جیسے میلوں کی مسافت طے کر لینے کے بعد وہ بالکل نڈھال ہو گیا ہو۔ ڈورتھی خلاف توقع جون کا چہرہ اترا ہوا دیکھا۔ جون کے کانوں میں جب ڈورتھی کے قدموں کی چاپ گئی تو اس نے گردن گھما کر کہا۔

"ڈورتھی ڈارلنگ میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا ـــ!"

"کیوں ـــ؟ کیسی طبیعت ہے تمہاری ـــ؟" ڈورتھی سامنے والے اسٹول کو پلنگ کے قریب کھینچ کر بیٹھ گئی۔ اور جون کے ہاتھ سے تولیہ لے کر اسکے پسینے خود پونچھنے لگی۔

"کچھ نہیں ڈورتھی، آج ذرا کھانسی آگئی ہے ـــ شاید خون بھی آیا ہے!"

"خون ؟" ڈورتھی کو ایسا محسوس ہوا جیسے اسکے سینے میں کسی نے تیز اور زہر میں بھیگا ہوا نشتر چبھا دیا ہو۔ تین مہینوں کے بعد آج پھر خون آگیا تھا۔ ڈورتھی نے دیکھا، جیسے وہ ڈوب رہی تھی سمندر کے بیچوں بیچ طوفان کی یلغار میں ڈوبنے سے بچنے کے لئے اس نے انتہائی کوشش کی، ہاتھ پیر مارے اتر پی اچھلی اور جب اسے یقین ہو گیا کہ وہ جلد ہی ساحل سے جا لگے گی تو یکایک اسے پھر غیر مرئی ہاتھوں نے سمندر کے بیچوں بیچ پھینک دیا۔ پھر وہی طوفان، وہی تھپیڑے۔ وہ سوچ کے گہرائی میں ڈوبتی چلی جارہی تھی، پھر آپ ہی آپ چونکی، دیکھا تو جون ٹکٹکی لگائے اسے دیکھ رہا ہے۔ اداس، غمزدہ جیسے ڈورتھی کے ایک ایک لمحہ ایک ایک پل سے واقف ہے۔ اسکے دل کی گہرائیوں میں سلگتی ہوئی آگ میں اسکے ساتھ خود بھی جل رہا ہو ڈورتھی، جس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے اور جو بھول گئی تھی کہ ڈاکٹر نے جون کے سامنے مغموم رہنے کی سخت ممانعت کی ہے اپنی آنکھوں میں آئے ہوئے دل کے خون کو چہرہ پھیر کر خشک کیا کہ جون دیکھ نہ پائے۔

"میرے جانے کے بعد کہیں تم گئے تھے ——؟"

"ہاں، وہاں سامنے سڑک تک۔ اکیلے گھر میں بیٹھے بیٹھے طبیعت گھبرا رہی تھی۔ سوچا ذرا ٹہل لوں جی بحال ہو جائے گا۔ آتے آتے تھک گیا تھا ڈارلنگ ——!"

ڈورتھی جانتی تھی کہ ڈاکٹروں نے جب اسے بستر سے اٹھنے تک کو نہیں کہا ہے تو جون اتنا چلا، پھر خون آ ہی گیا ہوگا۔ وہ جون کو ایک منٹ بھی تنہا نہیں چھوڑتی تھی کہ وہ اٹھنا چاہے تو اکیلے میں کیسے اٹھ سکے گا۔؟ آج اس کی محنتوں پر پانی پھر گیا۔ جو ڈر لگا ہوا تھا وہی ہوا۔ کاش وہ آج اسے تنہا چھوڑ کر نہ جاتی۔ یا جانے سے پہلے اسے ہر طرح کی تاکید کر دی ہوتی۔ اسکے جی میں آئی کہ وہ باہر آئے، اور آنکھوں میں بہہ آنے والے سیلاب کو چھوڑ دے، تاکہ اس طرح اسکے دل کا سارا غبار سارا درد دھل جائے، لیکن وہ جون کو چھوڑ کر جا نہ سکی اور سیلاب کو ضبط کر لیا۔ اس نے سوچا کہ اسے جون سے پہلے موت نہیں آسکتی۔ کیا جون سے پہلے وہ خود نہیں مر سکتی؟

انسان کتنا مجبور ہے۔ وہ سوچتی رہی —— سوچتی رہی —— اور آفتاب دور گھنے درختوں کے نیچے اتر گیا —— دھیرے دھیرے فضا میں دھند لکا پھیلنے لگا۔ اور اداس ماحول اور بھی

اداس ہوگیا۔ ڈورتھی پلنگ پر بیٹھ کر جون کے سر کو اپنی گود میں لئے آہستہ آہستہ سہلاتی رہی۔ اس کی نگاہیں دور آسمان پر پھولی ہوئی شفق پر لگی ہوئی تھیں جو دھندلکے میں جذب ہوتی جا رہی تھی۔

جون اپنا سر اس کی گود میں رکھ کر سو گیا تھا۔ اس نے آہستہ سے اس کے سر کو اٹھا کر تکئے پر رکھ دیا۔ کمرے میں دھندلکا گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ وہ لٹے ہوئے انسان کی طرح بوجھل قدموں سے لیمپ تک گئی اور اسے روشن کر دیا۔ اس نے دیکھا میز پر بیکری والا لڑکا نہ جانے کب روٹی رکھ کر چلا گیا تھا۔ روٹی دیکھ کر جیسے سوئی ہوئی بھوک بیدار ہو گئی۔ اسے احساس ہوا کہ وہ صبح سے دو توس اور ایک چائے کی پیالی پر اب تک ہے۔ اس نے سوچا اسے کچھ کھا لینا چاہیئے۔ بھوک تو آدمی کو اور بھی نڈھال کر دیتی ہے۔

"کھوں —— کھوں —— اوہ —— او —— !"

وہ ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ اس کا شوہر کھانسی کے باعث نیند سے جاگ اٹھا۔ اور پھر کھانسی کا تسلسل کچھ اس طرح بندھ گیا کہ ڈورتھی ڈر گئی۔ مبادا اسے کچھ ہو نہ جائے۔ جون کھانستا ہی جا رہا تھا اور ڈورتھی اسے بازوؤں کا سہارا دیئے اس کی پشت پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیر رہی تھی۔ نہایت گھبرائی ہوئی۔ پھر جون کی کھانسی دھیرے دھیرے تدریجی طور پر تھم گئی۔ اور وہ کٹی ہوئی شاخ کی طرح ڈورتھی کے بازوؤں میں جھول گیا۔ اور سر کو پلنگ سے نیچے کر کے تھوکتا رہا۔ ڈورتھی متوحش نگاہوں سے چراغ کی روشنی میں اس کے تھوک اور کھنکھار کے ساتھ آئے خون کی سرخی دیکھ رہی تھی۔ قریب تھا کہ وہ خود بیہوش ہو جاتی کہ اس نے ضبط کیا، اپنے کو سنبھالا۔

"دیکھو ڈورا خون تو نہیں —— !"

ڈورتھی نے پلنگ سے جھانک کر ایک دفعہ دیکھا اور کوشش کرنے کے باوجود جھوٹ نہ بول سکی وہ سچ بھی نہ بول سکی۔ خاموش رہی۔ دل میں اٹھتے ہوئے طوفان کو دبائے۔ آنکھوں میں بہہ آنے والے سیلاب کو تھامے —— کچھ لمحوں کے بعد جون نے خود ہی جھانک کر دیکھا۔ لیمپ کی مدھم روشنی میں فرش پر جا بجا خون کے دھبے نظر آئے۔ ڈورتھی نے دیکھا کہ یہ دیکھ کر اچانک اس کا رنگ زرد ہو گیا۔ اور پیشانی اور جسم پر پسینے بڑی تیزی سے بہنے لگے۔ وہ تولیہ لے کر جون کے پسینے خشک کرنے لگی۔ اس نے محسوس کیا کہ اسے اس وقت ضبط کرنا

ہے وہ جون کو کیا سنبھالے گی۔ وہ خود نڈھال ہوتی جا رہی ہے۔ وہ خود برسوں کی مریض نظر آنے لگی ہے اور پھر جب اس کی کیفیت کی طرف جون کا خیال گیا تو وہ متوحش نظروں سے گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

"کیا ہوا ڈورا؟ تم اس قدر گھبرا کیوں رہی ہو —— ؟"

اور اچانک ڈورتھی کو احساس ہوا کہ اس کا یوں پریشان ہو جانا بیمار خاوند کے لئے کس قدر مضر ثابت ہو سکتا ہے۔ جون کے لئے یہ زہر سے کم نہ ہوگا۔ اس نے جون کی پیشانی کا ایک طویل محبت آفریں بوسہ لیا اور بولی۔

"نہیں ڈارلنگ کچھ بھی تو نہیں ——!!" اور یہ کہتے کہتے اس کا دل بھر آیا۔ اس کے جی میں آئی کہ آج وہ جون سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر روئے۔ کچھ اس قدر کہ اس کا درد ڈھل کر بہہ جائے۔ وہ لرزتا ہوا نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبائے رہی —— دبائے رہی ——

"بہت خون آیا ہے —— ہے نا ڈورتھی —— ؟"

اور ڈورتھی نے سوچا۔ جواب میں کہہ دے، نہیں۔ مگر وہ سامنے پڑے ہوئے خون کو دیکھ رہی تھی، جو فرش پر جم کر کلیجی کی طرح ہو گیا تھا۔ ایک سخت اور پتھریلی حقیقت جس سے فرار ممکن نہیں۔ وہ جون کے اس سوال کا جواب نہ دے سکی۔ اب جون اسکے چہرے پر سے نظریں ہٹا کر جنگلے سے باہر کھلے ہوئے آسمان کو تک رہا تھا جہاں درختوں کے جھنڈ سے چاند اوپر اٹھ رہا تھا جس کے چہرے پر بھی زردی چھائی ہوئی تھی۔ نہ جانے کس سوگ میں نہ جانے کس غم میں۔

(۲)

اب تو اسے جون کی زندگی سے مایوسی ہو چلی تھی۔ وہ جون کے قریب سٹول پر بیٹھی اپنے خیالوں میں ڈوبی رہتی اسکے کانوں میں جیسے کوئی کہتا رہتا۔ یہ سب جھوٹ ہے ڈورتھی۔ ڈاکٹر سب جھوٹ بولتے ہیں۔ جون پھر سنبھل نہیں سکتا۔ جون اب جی نہیں سکتا۔ بیس روز کی لگاتار محنتوں اور انتھک کوششوں کے بعد جب اس کی صحت میں کچھ اضافہ ہو گیا تھا تو اسے کتنی مسرت ہو رہی تھی جیسے ششہجہات کی دولت مل گئی ہو۔ کتنی مصیبتوں سے وہ اس کا علاج کراتی رہی۔ دفتر کے مینجر سے پیشگی مانگی۔ اس نے دھتکار دیا۔ نوکری چھوٹ گئی۔ ڈاکٹروں کی خوشامد کی۔ حتیٰ کہ

اسے کمینے جیولر کی گالی بھی سننا پڑی۔ اس دوران میں اس کا نوکر بھی بھاگ گیا۔ جون کے علاج کے ساتھ ساتھ گھر کے سارے چھوٹے بڑے کام اسے خود سنبھالنے پڑے۔ اور اب اس کی تمام محنتوں اور کوششوں پر پانی پھر گیا تھا۔ جیسے ساحل کے قریب آئی ہوئی ڈورتھی کو پھر کسی غیر مرئی ہاتھ نے سمندر کے بیچ دھکیل دیا ہو۔ یہ دیکھ کر اسے کتنا صدمہ ہوا۔ آہ! ڈوبتے کو تنکے کا بھی سہارا نہ رہا۔

سمندر میں ڈوبتی ہوئی ڈورتھی نے سوچا ـــــ اگر جون مر گیا تو۔ ؟؟؟

جیسے کسی نے اس کے سینے پر میخ رکھ کر زور سے ہتھوڑا دے مارا ہو۔ اس نے جھنجھلا کر اپنے ذہن پر ابھرتی ہوئی تصویر کو بڑی بے دردی سے نوچ پھینکا۔ وہ کسی حالت میں جون کو زندہ دیکھنا چاہتی تھی۔ کچھ دیر وہ خالی الذہن ہو کر جون کو دیکھتی رہی ـــ جس کے چہرے کی سرخی اس کے خون کے ساتھ بہہ گئی تھی اور جون ہلدی کی طرح زرد ہو کر رہ گیا تھا۔ ہڈیوں کے ڈھانچے جون کی طرف دیکھتے دیکھتے اس نے اپنے ماضی کی طرف جھانک کر دیکھا۔ جہاں وہ جون کے ساتھ زندگی کے حسین ترین لمحات گزار چکی تھی۔ زندگی کا کارواں کمراٹوں اور رنگینیوں کے جلو میں گذر رہا تھا۔ اس وقت جون کس قدر خوبصورت اور وجیہہ تھا کہ وہ اُسے دیکھتی ہی رہتی اور کبھی نہ تھکتی ـــ جب جون لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس کے قریب آتا اور اپنے بھرے بھرے بازوؤں کی گرفت میں لے کر اپنا شہد آگیں ہونٹ اسکے ہونٹوں پر رکھ دیتا، تو ڈورتھی کو احساس ہوتا کہ جون کے ہونٹوں کی مٹھاس بوسے کے ذریعہ اس کی روح میں اترتی جا رہی ہے اور اسکے جسم کا ذرّہ ذرّہ شہد میں بھیگ گیا ہے۔ اور وہ سوچتی کاش تمام زندگی اسی کیفیت کی لذت کے سہارے گذر جاتی۔ اسی طرح وہ جون کی گرفت میں قید رہتی اور صدیاں گذر جاتیں اے کاش! لیکن پھر وہ جون کے دفتر چلے جانے کے بعد حد درجہ مغموم رہتی۔ تنہائی کا عارضی احساس اس کی حیات پر کچھ اس طرح مسلط ہو جاتا کہ وہ بارہا جون کو دیکھنے کے لئے اس کے دفتر تک جانے کا ارادہ کر لیتی۔ مگر صرف ارادہ۔ اور جب کبھی جون کو دفتر سے لوٹنے میں دیر ہو جاتی تو ایک ہندوستانی پردے میں رہنے والی خاتون کی طرح بے چین ہو اٹھتی۔

گھر میں ایک نوکر تھا، تنہائی اور بیکاری کے اذیت ناک لمحوں سے چھٹکارا پانے کے خیال سے وہ کسی مصروفیت میں کھو جانا چاہتی تھی۔ اور جب اس نے اپنے عندیہ کا ذکر جون سے کیا تو جون نے صلاح دی کہ وہ کہیں نوکری

کرے۔ وہ جون کی باتوں کو کب نہ مانتی تھی۔ اس نے حامی بھرلی۔ تھوڑے دنوں بعد ڈورتھی ایک دفتر میں نوکر ہوگئی۔ دفتر جانے سے ایک گھنٹہ قبل ہی وہ اور جون گھر سے نکل جاتے۔ وہ سائیکل کے آگے بیٹھی رہتی اور جون چلاتا رہتا۔ اور سائیکل دو رویہ درختوں سے گھری ہوئی سڑک کے سینے پر مونگ دلتی جارہی ہوتی۔ راستے میں اکادکا آنے جانے والے راہ گیر انھیں بڑی حسرت بھری نظروں سے دیکھتے رہتے اور سائیکل کو تار پر چرچراتی ہوئی نکل جاتی اور جب کوئی آس پاس آدمی نہ ہوتا تو جون اپنا ایک چوتھائی بوجھ اس پر ڈال دیتا اور پھر بے خیالی میں اس کی گردن کے نیچے سے اپنا منہ لاکر اس کے گالوں کو چوم لیتا۔ سائیکل ڈگمگا کر رہ جاتی اور وہ بظاہر غصے کا مظاہرہ کرتی تو جون ایک طویل قہقہہ لگاتا۔۔۔ جون اسے دفتر میں چھوڑ کر اپنے دفتر میں ہولیتا۔ اور جب وہ دفتر سے نکلتی تو دیکھتی کہ جون اس کا منتظر ہے۔ انھوں نے اپنا معمول بنا لیا تھا۔ کبھی جون کسی وجہ سے خلاف معمول نہ آسکتا، تو پھر وہ گھر میں جاکر جون سے خوب لڑتی۔ بالکل اپنے پڑوس میں رہنے والی مسلمان عورت کی طرح ۔۔۔ ڈورتھی کی زندگی پر جون اپنی تمام دلآویزیوں کے ساتھ چھایا ہوا تھا۔ دفتر میں کچھ کر رہی ہو اس وقت بھی جون اس کے سامنے کھڑا مسکرا رہا ہوتا یا سیٹی بجا رہا ہوتا یا اس کے گالوں کے چومنے کے لئے بڑھ رہا ہوتا۔۔۔ کام کرتے وقت وہ چاہتی تھی کہ کسی طرح جون اسکے سامنے نہ آجایا کرے۔ اس طرح تو وہ کچھ بھی نہ کر سکے گی۔ ایسی جذباتیت بھی کیا۔۔۔؟ اسے وہ دن آج بھی یاد ہے جب اس نے نوٹس لیتے ہوئے بے خیالی میں کاپی کے حاشیے پر جابجا، جون ڈارلنگ لکھ دیا تھا جسے اس کے قریب میں بیٹھنے والی لڑکی نے بتایا تھا۔ اور وہ چونک کر اس کو مٹانے میں محو ہوگئی تھی۔ کتنی شرمندگی محسوس کر رہی تھی اس وقت وہ۔۔۔!

(۳)

اب جون کی کھانسی نسبتاً کم ہوگئی تھی۔ شاید دوا اور انجکشن نے اثر کیا تھا۔ یا شاید نقاہت کے باعث وہ کھانس نہ سکتا۔ ڈورتھی اگالدان اس کے قریب لائی۔ اس نے کھنکھار کر اس میں تھوک دیا۔ دو دن سے قریب قریب خون آنا بالکل بند ہوگیا تھا۔ پھر بھی تھوک کے ساتھ ہلکی سرخی آہی جاتی۔ پلنگ کے نیچے اگالدان رکھ کر ڈورتھی نے پانی کا گلاس اس کی طرف بڑھا دیا۔

"ڈاکٹروں نے کیا کہا ڈورا ؟ کیا میں مرجاؤں گا ؟ جون نے گلاس واپس دیتے ہوئے کہا۔ جیسے بالکل ہار گیا ہو۔

"کیسی باتیں کرتے ہو ڈارلنگ ۔ ؟ ڈاکٹروں نے تو امید دلائی ہے کہ تم اچھے ہو جاؤ گے۔ دیکھو نا خون بھی آنا بند ہو گیا ہے۔ اور ٹمپریچر بھی نہیں رہتا۔ ایسی باتیں سوچ کر تم کیوں اپنے آپ کو ہلکان کرتے ہو۔ خدا کے لئے ایسی باتیں نہ کیا کرو ڈارلنگ ـــــ خدا کے لئے ـــــ میرا کلیجہ پھٹ جاتا ہے ـــ!"

اور یہ کہتے کہتے ڈورتھی کی آنکھیں بھر آئیں۔ لیکن اس نے ضبط کر لیا۔ آنکھوں کے آنسو آنکھوں میں خشک ہو گئے۔ جون چپ چاپ کھڑکی سے آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ صاف اور بے داغ آسمان ڈورتھی کی زندگی کی طرح حسین اور پاکیزہ آسمان کی وسعت کو تک رہا تھا۔ اچانک اس نے چہرہ پھیرتے ہوئے کہا۔

"ڈورا تمھیں یاد ہے وہ شام ؟ ہماری شادی کو تھوڑے ہی دن گذرے تھے۔ ہنی مون منانے کے لئے ہم دار جلنگ گئے ہوئے تھے۔ صاف شفاف جھیل کے کنارے بیٹھی تم مجھے نغمے سنایا کرتی تھیں۔ بائرن کی نظمیں، پشکن کی کے تنے، ٹیگور کے گیت، یا کبھی کبھی چاندنی راتوں میں درخت تلے مون لائٹ اینڈ شیڈو MOON LIGHT AND SHADOW اس وقت زندگی کتنی خوبصورت تھی ڈورا ؟

اور اس روز جب میں نے تمھیں شیلے کی نظم سنانے کو کہا۔ تو تم نے یوں ہی ناز سے کہا۔ نہیں"۔ پھر بڑی دیر کی منت سماجت کے بعد تم کتنی پرسوز آواز میں گانے لگی تھیں۔

"جب تم نہیں ہوتے۔"

جیسے ساری کائنات تمہاری آواز کے سحر میں ڈوب جا رہی تھی۔ ڈارلنگ کیا مجھے تم وہ نغمہ آج پھر سناؤ گی ؟ وہی "جب تم نہیں ہوتے۔" وہی شیلے کی نظم ـــ!"

اور جون نے آسمان کی طرف چہرہ پھیر کر بڑی ملتجی انداز میں دیکھا۔ جون کے منع کرنے کے باوجود ڈورتھی اس کے پلنگ پر بیٹھ گئی۔ اسکے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے اس کے جی میں آیا کہ کہہ دے کہ اس سے اس وقت کچھ گایا نہ جائے گا۔ وہ گذرے ہوئے خوشی کے لمحوں کو یاد دلا کر اسے پریشان نہیں کرنا چاہتی۔ جون کا پریشان ہو جانا اسکے لئے سوہان روح ہو جاتا ہے ـــــ وہ نہیں گائے گی۔

"تم گاؤ گی ڈارلنگ ؟" جیسے ڈورتھی کے لاشعور سے آواز آئی۔ "ہاں گاؤں گی" اور وہ گانے لگی ہلکی ہلکی، مدھم مدھم آواز میں۔ جیسے کوئی روح کو زخمی کرتا چلا جا رہا ہو اور احساس تک نہ ہو رہا ہو۔

موسیقی،

جب نقرئی آواز کھو جاتی ہے۔ ذہنی فضا پر تھرتھراتی رہتی ہے۔

خوشبو،

جب غمگین پھول پژمردہ ہو جاتے ہیں۔ اس حسن میں زندہ رہتی ہے جس کو اس نے بیدار کر دیا ہے۔

گلاب کی پتیاں،

جب گلاب بکھر جاتا ہے۔ محبوب کی سیج پر بکھیر دی جاتی ہیں۔

اسی طرح تیرے خیال پر جب تو میرے پاس نہیں آتا — خود عشق آرام کرتا ہے۔

(۴)

رفتہ رفتہ جون کی حالت سنبھلتی جا رہی تھی۔ اگرچہ اسے کھانا دانا ہضم نہیں ہوتا تھا۔ اور اجابت نسبتاً زیادہ ہونے لگی تھی۔ لیکن ڈورتھی اور ڈاکٹروں کو یقین تھا کہ جون مائل بہ صحت ہے۔ خون آنا قطعی بند ہو گیا تھا۔ اور بخار بھی نہیں آتا تھا تے اور دست تو شاید موسم کی خرابی یا دواؤں کے زیادہ استعمال کی وجہ سے ہوتے تھے۔ ڈورتھی کی محنت اور روپے خلاف توقع ضائع نہیں ہو رہے تھے۔ لیکن جیسے جیسے دن گذرتے جا رہے تھے اسے ایک فکر دامن گیر ہوتی جا رہی تھی۔ پیسے کا خرچ زیادہ تھا اور آمدنی کا راستہ مسدود۔ اس نے اپنا ہار بیچ دیا۔ سامان فروخت کر دیا۔ بنک میں جون کے نام سے رکھے ہوئے روپے جو جون کے والد مرتے ہوئے اسے دے گئے تھے قریب قریب ختم ہو گئے تھے۔ وہ کہاں جائیے، اس تاریک دنیا میں۔ اسے دور نزدیک روشنی کی ایک کرن بھی تو دکھائی نہیں دے رہی تھی — ڈورتھی چپ تھی۔ آس پاس اندھیرا تھا۔ وہ ڈورتھی جو جون سین تھی، لا رما نہیں تھی۔ جو ہندوستان کے چھوٹے سے شہر میں مفلس، قلاش پڑی تھی۔ کوئی بھی تو نہ تھا جو اس کی آنکھوں میں سے امڈے ہوئے آنسوؤں کو خشک

کرتا۔ مایوسی کے اس تیرہ و تار ماحول سے نکالتا ــــ اب تو اسکے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ جسے وہ بیچ کر ابکا۔۔۔
’اگر زیور نہ بھی ہو تو کوئی ہرج ــــ نہیں ــــ میڈم ــــ صرف آپ کا ہونا کافی ہے‘۔
جیسے دور بہت دور سے ایک منحنی سی آواز آرہی تھی۔ اور وہ بنگالی جیولر اس اتھاہ تاریکی میں مینارِ نور کی طرح ابھرتا سا دکھائی دیا ــــ جیسے ڈوبتے کو تنکے کا سہارا ــــ بنگالی جیولر ــــ اور ڈورتھی نے اپنے ذہن پر ابھرنے والی تصویر کو بڑی بے دردی سے نوچ پھینکا ــــ اگر زیور نہ ہو ــــ اگر زیور نہ ہو ــــ اگر زیور نہ ہو ــــ ڈورتھی نے گھبرا کر اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔

”ڈورتھی ــــ! ڈورو، تم بولتی کیوں نہیں ؟؟“

”ہاں“ وہ بولی۔ مگر جیسے اس کے پاس بولنے کو اور کچھ نہ رہ گیا ہو۔

”ڈورتھی تمھیں کیا ہو گیا ہے۔ اب میری باتوں کا جواب دینا بھی گوارا نہیں کرتیں کل اسٹریپٹومائی سین (STEPTOMYCIN) کے انجکشن بھی نہیں دلائے جا سکے۔ ڈاکٹروں نے سینے ٹوریم میں داخل کروانے کو کہا تھا۔ تم سے وہ بھی نہ ہو سکا۔ آخر تم کیا چاہتی ہو کہ میں مر جاؤں ــــ؟“ یہ کہتے کہتے جون کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس کی آواز رندھ گئی اور ڈورتھی کو ایسا لگا، جیسے کسی نے اس کے سینے میں نشتر چبھو دیا ہو وہ تڑپ اٹھی

”نہیں نہیں جون ڈارلنگ، تم ایسا نہ کہو۔ تم خدا کے لئے یوں نہ کہو ــــ!“ اُس کا جی بھر آیا۔ اور وہ سب کچھ بھول کر، سب کچھ فراموش کر کے اس کے گالوں سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اور یہ دیکھ کر جون بھی ضبط نہ کر سکا گھنٹوں وہ روتے رہے۔ گھنٹوں ــــ جیسے سارا دکھ، سارا درد ڈھل کر بہہ رہا ہو۔ جیسے کائنات میں بجز دونوں کے اور کوئی نہ ہو۔

(۵)

ڈورتھی ــــ؟“

اور ڈورتھی بدستور سائیکل میں ہوا بھرتی رہی۔

”ڈارلنگ ــــ؟“

ڈارلنگ چپ رہی!

"ڈورو تم مر تو نہیں گئیں ۔۔ ؟"

"کیا ہے ڈارلنگ ۔۔" خیالوں میں کھوئی ہوئی ڈورتھی چونکی ۔ اندر اس نے سوچا کاش ایسا ہو سکتا ۔ کاش ایسا ہو سکتا ۔ کاش وہ یہ سب کچھ دیکھنے سے پہلے مر گئی ہوتی ۔ اے کاش ۔۔!

"تم آج کہاں جا رہی ہو ۔۔؟"

ڈورتھی نے لیمپ سائیکل سے نکالتے ہوئے کہا ۔

"روشنی لانے ۔ گھر کی تاریکی کے لئے روشنی تو چاہیئے ہی ۔۔!"

"میں سمجھا نہیں ، تم آج کیا کہہ رہی ہو ؟"

سچ کہہ رہی ہوں ڈارلنگ ۔ ٹمرڈس والی مسلمان عورت کہتی ہے کہ جنت میں پھول ہوتے ہیں اور جہنم میں آگ ۔ میں آج جہنم جا رہی ہوں ۔ جہنم سے روشنی لانے ۔۔!" اس کی آواز میں درد تھا ۔ روحانی کرب اور اذیت کا پرتو تھا ۔۔ اور وہ باہر نکل گئی ۔ دور یہ مکانوں اور درختوں سے گھری ہوئی سنسان اور بیوہ کی چھاتی کی طرح تنہا بہنے والی سڑک کے سینے پر ڈورتھی سائیکل مونگ دلتی ہوئی آہستہ چلنے لگی ۔ آہستہ آہستہ جیسے پہیے کی ہوا نکل گئی ہو ۔ اور ڈورتھی سائیکل پر بیٹھی اپنے ماحول سے لاپرواہ سوچ کے سمندر میں ڈوبی رہی ۔ آج اسے سب کچھ کرنا پڑے گا ۔ آج وہ خود اس پستی میں گرنے جا رہی ہے ۔۔ کچے دھاگے سے بندھی ہوئی ایک غیر محسوس طاقت کے ماتحت سوچتی ہوئی آنکھوں سے بہہ کر آنے والے سیلاب کو روکے ہوئے ۔

سرخ اینٹوں سے بنی ہوئی گرجا کی عمارت اس کے قریب آگئی تھی ۔ اس کی نگاہیں آپ ہی آپ یسوع کے مجسمے پر جا لگیں ۔ یسوع کے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے تھے ، جیسے وہ کسی کو اپنی پناہ میں لے لینا چاہتا ہو ۔ اور اس کے چہرے پر ایک نورانی مسکراہٹ تھی اور اسکے ہونٹ ہل رہے تھے جیسے کہہ رہے ہوں "لڑکی اٹھ ۔۔ لڑکی ، اس پستی سے اٹھ ۔۔ !! اٹھ لڑکی اٹھ ۔۔ !!!" ڈورتھی کی آنکھوں میں آنسو آگئے ۔ اس کے جی میں آئی کہ اس آواز پر لبیک کہے ، اور یسوع کے قدم پر گر کر اتنا روئے ، اتنا روئے کہ اس کا سارا درد ، سارا غم بہہ جائے ۔ لیکن جون ۔۔ ؟

اور اس کی سائیکل آگے بڑھ گئی۔

"لڑکی اٹھ، اس پستی سے اٹھ — !" یسوع کی آواز اس کا تعاقب کر رہی تھی!"

"لڑکی — اُٹھ!"

اور اس کی سائیکل جیسے آپ ہی آپ ایک چکر کاٹ کر گھوم گئی اور ڈورتھی اتر کر یسوع کے قدموں پر گر پڑی اور پہروں روتی رہی۔

اور جب یسوع کے قدموں سے الگ ہوئی تو فضا پہ ایک دھندلکا سا چھانے لگا تھا۔ اور اس نے محسوس کیا۔ جیسے واقعی اسکے دکھ کا بارگراں ہلکا پڑ گیا — اسے جون کا خیال آیا، اور وہ سائیکل لئے تیزی سے اپنے گھر کی طرف لوٹ گئی۔ اس نے سوچا کہ وہ جاکے جون کو سینے سے چمٹا لے گی، اور کہے گی، دیکھو ڈارلنگ میں کتنی بشاش ہوں۔ دیکھو میں روشنی لے آئی ایک مقدس روشنی۔

جب وہ اپنے کمرے میں داخل ہوئی تو دیکھا کہ کمرے میں دھندلکا گہرا ہو گیا ہے۔ اور اس دھندلکے میں جون بے خبر سو رہا ہے اور بے خیالی میں اس کا ایک ہاتھ پلنگ سے نیچے لٹک رہا ہے اور کمرے میں اس کا گایا ہوا شیلے کا نغمہ ابھی تک گونج رہا ہے۔

گلاب کی پتیاں،

جب گلاب بکھر جاتا ہے۔
محبوب کی سیج پہ بکھیر دی جاتی ہیں۔
اسی طرح تیرے خیال پر جب تو میرے پاس نہیں ہوتا۔
خود عشق آرام کرتا ہے۔

:-:

رسالہ نہ ملنے کی شکایت محکمۂ ڈاک سے بھی کیجئے

آغا بابر

نیم کے پتّے

یہ بات تو اس پر واضح تھی کہ عورت کی تہ در تہ اور پیچ در پیچ گھنڈیوں سے بنی ہوئی ہے۔ مگر یہ عورت پہلے لڑے، پھر کوسے، پھر طعنے دے، پھر لڑائی کو جنگ میں تبدیل کر دے اور مرد پر اتنے دستی بم پھینکے کہ اس کی روح کے چیتھڑے اڑ اڑ کر ماضی، حال اور مستقبل کی کھونٹیوں پر لٹک جائیں اور جب ان میں سے قطرہ قطرہ ہو کر حسرتوں کا خون ٹپکنے لگے تو مجبور و مقہور مرد سے پھر وہ چیت لیٹ کر شروع سے آخیر تک پورا پیار کرائے اور پھر اس طرح سکون سے سو جائے جیسے اِن دونوں میں کھٹنی نہ ہو۔ اس کا اسے علم نہ تھا۔

طوفان گزرنے کے بعد اجڑے ہوئے آشیانے کو بنانا خود اعتمادی کا عنوان ہوتا ہے مگر جب بار بار سیلاب اور آندھیاں آ کر دیواروں کو گرائیں اور سامان بہا لے جائیں تو آدمی تھک ہار کر ہاتھ پاؤں ڈال دیتا ہے۔ ہویدا کئی مہینوں سے عثمان کے پرزے اڑا رہی تھی۔ جنھیں وہ پھر جوڑ لیتا۔ یہ اس کا بڑا کارنامہ تھا۔ ہویدا کے اندر بیزاری اور غصّے کی چنگاریاں بھری رہتیں مگر عثمان سراسر مفاہمت بنا رہتا۔

وہ اپنے دوستوں اور ان کی بیویوں سے ہویدا کو امن اور راحت کی خاطر بلواتا مگر ہویدا گھر پہنچتے پہنچتے آگ بگولا ہو جاتی۔ غصّے کی چنگاریاں چھپا لیتی جو رات کو انار بن کر چھوٹتیں اور خطرناک بارود کے پٹاخے اور ٹھلکے بن کر عثمان کے مردانہ وقار اور انا کے لیے خطرہ کھڑا کر دیتیں۔ وہ اس دم بدم بھڑکنے والی آگ سے اپنی روح کے جامے کو بچانے کی بار بار کوشش کرتا مگر پے در پے دھماکے اسے عاجز کر دیتے۔ ایک چنگاری ایسی لگتی کہ جامہ جل کر راکھ ہو جاتا۔

"تمھارا شمشاد کی بیوی سے تعلق ہے۔ میں نے اس کی شہرت بھی سن لی آنکھوں سے بھی دیکھ لیا۔
افضال کی بیوی تمھارے ساتھ اتنی بے تکلف کیوں ہے؟ تم کسی کو تو چھوڑ دو۔ ڈائن بھی چار گھر چھوڑ دیتی
ہے۔" عثمان کی روح کے پرزے اڑتے۔ گھر کو آگ دکھا دی جاتی۔ احساسات الجھنے لگتے۔ مجبور اور
دیوانی پرچھائیاں روح کے گرد ناچنے لگتیں۔ وہ اپنے مردانہ وقار اور انا پر ان حملوں کی تاب
نہ لاسکتا۔ اس کی سوچ جواب دے جاتی۔ اس کا ذہن رک جاتا۔ وہ نڈھال اور بے بس ہو کر
کرسی پر گر پڑتا۔ اس کی جھولی میں مرجھائے ہوئے پھولوں کے سوا کچھ نہ ہوتا۔ وہ بے بسی سے ستاروں
کو دیکھتا، رات کے سناٹے کو سنتا۔ اس کے اندر زخم کھائے ہوئے سانپ کا انتقام جاگتا۔ پھر اس کا
پیچ و تاب اور اضطراب دیکھنے کو کہکشاں کی پرسکون جھلملاہٹ جیسے اس پر جھک جاتی۔
صفائی کی گواہیاں، شہادتیں اور بیانات تکان سے چور ہو کر گر پڑتے۔

"تمھیں مجھ سے پیار نہیں رہا۔"

"کون کہتا ہے؟" عثمان ہوید اپر جھک جاتا۔ کہکشاں کھسک کر دور وہیں اپنی جگہ
جا کر مسکرانے لگتی۔

رات کا اندھیرا گہرا ہوتے ہوتے بہت گہرا ہو جاتا۔ پھر صبح کا ستارہ نمودار ہوتا تو پھول اور
کانٹا ایک جان ہو گئے ہوتے۔ ہویدا عثمان کے بازوؤں میں بڑے سکون سے سوئی پڑی ہوتی۔

جب سے عثمان کی جھولی میں شمشاد اور افضال کی بیویوں کو ڈال دیا گیا تھا۔ ان عورتوں
سے عثمان کے لیے نگاہ ملانا مشکل ہو گیا تھا۔ انھیں کہیں دیکھ لیتا تو نگاہیں دوسری طرف پھیر لیتا
اس نے ہویدا کی خوشی کے لیے شمشاد اور افضال سے ملنا ترک کر دیا مگر ہویدا اب بھی مطمئن نہ تھی۔
ہر عورت اس کی بیرن تھی جس جگہ جاتے وہ عثمان پر نگاہ رکھتی کہ وہ کسی عورت سے دو باتوں سے
تیسری بات نہ کرنے پائے۔ اور اگر کسی سے ذرا لمبی بات ہو جاتی تو عثمان کی شامت آجاتی۔ کیا
کہتی تھی؟ تم نے کیا کہا؟ کیوں کہا؟ تمھیں کیا ضرورت تھی اس سے بات کرنے کی؟

مسز مرزا ہویدا کی نئی دوست بنی تھی۔ ایک پارٹی پر عثمان نے اس سے اتنا پوچھ لیا۔

"مرزا کہاں ہیں؟"

"کراچی"!

"کب آئیں گے کراچی سے؟"

اس دن تاروں بھرے آسمان کے نیچے دونوں اپنی اپنی آرام کرسیوں پر اس طرح مورچے سنبھال کر بیٹھ گئے جیسے بڑا سخت رن پڑنے والا ہو۔

ہویدا نے حملہ کیا "تمھیں کیا ضرورت تھی دخل در معقولات کی۔ مرزا کہاں ہیں اور کراچی سے کب آئیں گے۔ کیا تم مرزا کی عدم موجودگی میں مسز مرزا کا خاوند بننا چاہتے ہو؟"

عثمان کے انا کی گردن ٹوٹتے ٹوٹتے بچی۔ حملہ آور خود کرسیوں پر نہ بیٹھے ہوتے تو کرسیاں چل جاتیں۔

"دیکھ ہویدا زبان قابو میں رکھ!"

"تم دونوں بھائی حرامزادے ہو!"

عثمان تڑپ اٹھا۔ اس کا ہاتھ طمانچے کے لیے ہوا میں لہرا کر رک گیا۔ مگر عثمان کا گریبان ہویدا کے ہاتھ میں آکر چیری بنی ہوگیا۔

وہ عثمان کے کتنی قریب ہو کر کتنی دور ہوگئی تھی۔ عثمان نے اپنے ننگے سینے کے ساتھ اسے چمٹا لیا۔ غصے اور زہر کی چنگاری پر برف پڑ گئی۔ وہ سسکیاں بھر بھر کر رونے لگی۔ ایکا ایکی چاند پر بدلی کی جھالر لٹک گئی۔ نسوانیت کے ابریشمی پرتو کے بند کھل گئے۔ پھر عثمان کی مجروح اور لنگڑی روح اسے ریلنے پیلنے میں لگ گئی۔

وہ اپنی چارپائی پر لیٹ کر جذبات کے اس ژولیدہ و پیچیدہ مد و جزر کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگا جو اس کے فہم و ادراک سے ماورا تھا۔ اس اوپر سے ٹھونسے جانے والے میکانکی انداز محبت سے اس کی روح کا تمام حظ اور حس کی تمام حلاوت رخصت ہو چکی تھی۔ مجروح جذبات کے ہوتے ہوئے محبت امڈ کر کیسے آئے؟ یہ کڑی آزمائش اس کے لیے سوہانِ روح بن گئی تھی جیسے شکستہ پا غزال سے کوئی اشقی القلب چوکڑیاں بھرنے کو کہیں اور غزال کی آنکھوں میں بے بسی اور مجبوری جھانکنے لگے۔

وہ سوچنے لگا۔ کتنے خوش نصیب ہوں گے وہ شوہر جن کی بیویاں دوسروں سے لڑتی جھگڑتی

ہوں گی مگر اپنے خاوندوں سے صلح رکھتی ہونگی۔

"میں کہتا ہوں یہ صاحب کا حوصلہ ہے۔ اپنی جورو ایسی ہو تو گردن کاٹ کے رکھ دوں۔ سات سلام ہوں ایسی نوکری کو۔" ڈرائیور نے روز کی تناتنی دیکھی تو نوکری چھوڑ کر چل دیا۔

ایک روز عثمان باغیچہ میں بیٹھا اخبار دیکھ رہا تھا۔ ہویدا پاس آکر بیٹھ گئی۔ ایک لمحہ کے لیے عثمان خوش ہوا کہ زندگی کتنی اچھی ہے۔ ہویدا نے نظر گھما کر ادھر ادھر دیکھا اور بولی:

"اچھا مالن کو دیکھ رہے ہو؟"

"کیا؟" عثمان بھونچکارہ گیا۔

"وہ سامنے بیٹھی بچے کو چھاتیوں سے دودھ پلا رہی ہے۔ حرامزادی کے لیے جیسے یہی جگہ رہ گئی تھی۔"

عثمان نے ہڑبڑا کر دیکھا۔ دور پودوں کے پیچھے مالن گود میں بچے کو لیے بیٹھی تھی۔ مگر اسے یہ اب معلوم ہوا تھا۔

ہویدا اٹھ کر نوکروں کے کواٹروں کی طرف چل دی۔ عثمان نے دل میں کہا ہویدا کی چال کتنی اچھی ہے۔ پھر قدموں کی چاپ سن کر اس نے اخبار چہرے کے سامنے سے ہٹایا تو ہویدا اور مالن اس کی طرف چلی آرہی تھیں مالن کی قمیص پر جہاں اس کی دودھ سے ابلتی چھاتیوں کی اکڑاہٹ تھی گیلے دودھ کے دھبے تھے جیسے وہ بچے کے منہ سے دودھ کھینچ کر چلی آئی ہو۔

"میرے میاں تیرے ساتھ کوئی بات کرنا چاہتے ہیں۔ یہاں ان کے پاس بیٹھ جا۔ کرسی پر بیٹھ۔"

ہویدا کی زبان میں سخت زہر بھرا ہوا تھا۔

مالن عاجزانہ طور سے عثمان اور ہویدا کی طرف بٹر بٹر دیکھ رہی تھی۔ عثمان کے جذبات ایک دم بھڑک اٹھے۔ اس کا جی چاہا کہ اٹھ کر مالن کے سامنے ہویدا کے منہ پر دو تین جڑ دے کہ لو یہ ہوتا ہے نتیجہ مرد کے انا کا بار بار تپتی سیخوں سے داغنے کا۔ مگر اس کا مزاج پھر روح کی

دھجیاں جوڑنے اور غصّہ پی جانے کا کارنامہ سرانجام دے گیا۔

اگلے روز صبح صبح مالی اور اس کی بیوی نے کوارٹر خالی کر دیا۔ مالی کے چلے جانے سے ہویدا کو کوئی تکلیف نہ ہوئی مگر ڈرائیور کے چلے جانے سے بڑی دشواری ہو رہی تھی۔ پڑوس کی کوٹھی کا ڈرائیور ایک جان پہچان والے کو لے آیا اور بولا "بیگم صاحب، دلاور خاں ایک انگلش کمپنی میں ملازم تھا۔ بڑی اچھی گاڑی چلاتا ہے مگر اب برے دن آپڑے ہیں۔ آپ جو تنخواہ دیں گی اسے منظور ہو گی۔"

ہویدا نے پہلے گاڑی چلوا کر دیکھی پھر سو روپے تنخواہ مقرر ہو گئی۔ لانے والے نے کہا "اس کی بیوی بچے کسی پرائے گھر میں پڑے ہوئے ہیں۔ اگر اسے ملازموں کے کوارٹروں میں جگہ مل جائے تو بے فکری ہو جائے گی۔"

"ہاں کیوں نہیں۔"

دلاور خاں بیوی اور چار بچوں کے ساتھ کوارٹر میں رہنے لگا۔ کپڑے بچوں کے تن پر کہاں تھے۔ دو بڑے گندے سے چیتھڑے پہنے پھرتے۔ دو چھوٹے ننگ دھڑنگ پھرا کرتے۔ بیوی برقع پہنتی اور سخت پردہ کرتی۔ عثمان دورے سے آیا تو اس نے کوٹھی کے احاطے سے گزرنے والے ان گورے گورے مگر میل سے اٹے بچوں کو دیکھ کر پوچھا "یہ کون ہیں؟"

"ڈرائیور کے بچے ہیں۔ آپ کے پیچھے میں نے ڈرائیور رکھ لیا ہے۔"

"گاڑی ٹھیک چلاتا ہے؟"

"جی ہاں۔"

ڈرائیور نے آکر سلام کیا۔ عثمان نے اس کی پہلی نوکریوں کا آگا پیچھا پوچھا پھر لائسنس دیکھ کر بولا:

"تمھارے بچے بہت خوبصورت ہیں۔ انھیں صاف رکھا کرو۔ کیا تمھارا کوئی بچہ منہ نہیں دھوتا؟ بڑے گندے رہتے ہیں۔"

"نہیں صاحب اب صاف رہیں گے۔ اصل میں غربت بڑی رہی ہے سرکار۔ بڑا لڑکا گیارہ بارہ برس کا ہے۔ اگر اسے کہیں نوکری دلا دیں تو دعائیں دوں گا۔"

"کرا دیں گے۔ جاؤ گاڑی صاف کرو۔"

دلاور خاں کے کوارٹر کی کھڑکی ہویدا کے سونے کے کمرے کے رخ تھی۔ جب عثمان کے دفتر چلے جانے کے بعد کھلتی تو گوری چٹی عورت نظر آتی جس کا لباس اکثر سرخ ہوتا جس میں وہ سونے کی طرح دمکتی رہتی ہے۔

ایک دن کار میں ہویدا نے دلاور خاں سے کہا "ڈرائیور تمھاری بیوی بڑی خوبصورت ہے۔"

"جی ہاں بیگم صاحب، پانچ بچے پیدا کرنے پر بھی اس کی کاٹھی بڑی مضبوط رہی۔"

"تمھارے چار بچے ہیں یا پانچ؟"

"جی ایک مر گیا تھا۔"

دھوپ کا رنگ اب زرد ہو گیا۔ اور تیزی بھی کم ہونے لگی تھی۔ رات کو خنکی ہو جاتی۔ کوّے درختوں اور منڈیروں پر کائیں کائیں کرتے پھرتے۔ ایک دن عثمان اور ہویدا برآمدے میں بیٹھے تھے۔ ہویدا ٹرنکوں میں سے گرم کپڑے نکال نکال کر دیوان پر رکھ رہی تھی۔ جن میں سے اکا دکا فینائل کی گولیاں نیچے گر رہی تھیں اور بچے سال بھر آنکھوں سے اوجھل بند رہنے والے کپڑوں کو دیکھ دیکھ کر اٹھا اٹھا کر خوش ہو رہے تھے۔

کچھ پھٹکل مال ہویدا نے ایک طرف ڈھیر کر دیا۔ عثمان کا ایک پرانا کوٹ جسے پہننا وہ ترک کر چکا تھا اس نے اٹھا کر پوچھا۔ "یہ تو آپ نہیں پہنتے۔ ڈرائیور کو دے دوں۔"

"دے دو۔"

اس نے ڈرائیور کو بلوا کر کہا۔ "ڈرائیور یہ ہمارے بچوں کے کپڑے ہیں۔ تمھارے بچوں کو آ جائیں گے۔ یہ کوٹ تمھارے لیے ہے۔"

ڈرائیور گٹھر اٹھا کر دعائیں دیتا چلا گیا۔ کوارٹر کی طرف سے بچوں کا شور سنائی دیا

جو خوشی سے بے چین تھے۔ پھر ڈرائیور کی آواز سنائی دی۔" او کمینوں ابھی رہنے دو۔ جب سردی شروع ہو گی پھر پہننا۔"

گھٹنوں چلتا گود کا بچہ پودوں کی اوٹ سے باہر نکل آتا تو اسے اٹھانے کو جب لپکتی تو ڈرائیور کی بیوی کی جھلک دکھائی دیتی۔ ایک روز ہویدا نے دیکھا۔ کار میں بیٹھتے وقت عثمان کی نگاہیں کوارٹر کی طرف اٹھی تھیں۔ پھر یہ واقعہ ہوا کہ عثمان دفتر جانے کے لیے کپڑے بدل رہا تھا کہ ادھر کھڑکی کا پردہ اٹھا ہوا تھا۔ ادھر دلاور خاں کے کوارٹر کی کھڑکی کے پٹ کھلے تھے۔

"میں اس حرامزادی کو تو آج ہی نکال باہر کرتی ہوں۔"

"کس کو؟" عثمان نے شیشے میں نکٹائی باندھتے ہوئے پوچھا۔

"جس کو آپ دیکھ رہے ہیں، جس نے کھڑکی کھول رکھی ہے۔"

ہویدا ایک دم سے باہر چلی گئی اور اس نے تنک کر آواز دی۔" ڈرائیور ادھر آؤ۔"

دلاور خاں جو گاڑی صاف کر رہا تھا "جی" کہہ کر لپکا۔ ہویدا نے اس سے کہا۔

"میں نے پہلے روز کہہ دیا تھا کہ یہ کھڑکی صاحب کے دفتر جانے کے بعد کھلے گی۔ کہا تھا نا۔ ابھی صاحب دفتر نہیں گئے۔ تمھاری بیوی نے یہ کھڑکی کیوں کھولی ہے۔"

اس نے جا کر کچھ کہا۔ کھڑکی کھٹ سے بند ہو گئی۔

عثمان کو جب گاڑی چھوڑ آئی تو ہویدا بازار چلی گئی۔ جب آئی تو اسکول کا وقت ہو گیا تھا۔ اس نے ڈرائیور کو بچوں کو لینے اسکول بھیج دیا۔ ملازم کو دلاور خاں کی بیوی کو بلانے بھیجا اور خود برآمدے میں بیٹھ گئی۔ نوکر نے آکر کہا۔" وہ کہتی ہے مجھے گھر سے باہر قدم رکھنے کی اجازت نہیں۔"

"اچھا یہ بات ہے۔" ہویدا غصّے میں اٹھی اور دو قدموں میں ملازموں کے کوارٹروں تک جا دھمکی۔ دلاور خاں کی بیوی برتن دھو رہی تھی۔" میں نے تمھیں بلا بھیجا تھا۔ تم نے کہا مجھے گھر سے باہر قدم رکھنے کی اجازت نہیں۔ اتنی نواب زادی ہو تم مجھے پتہ نہ تھا مگر اتنا پتہ ہے کہ تم وقت بے وقت کھڑکی کھول کر اپنا جوبن میرے میاں کو دکھاتی رہتی ہو۔ میں نے

سوچا تھا صاحب سے آج تمھاری ملاقات کرادوں۔ دونوں کی بے چینی دور ہو جائے"۔

دلاور خاں کی بیوی کا رنگ لمحہ بھر کے لیے پیلا پڑ گیا۔ وہ ہاتھ دھو کر اٹھ بیٹھی اور بولی "میرے خاوند کو تو جوبن دکھاتی پھرتی ہے۔ تیری بے چینی دور ہو جاتی ہے جب کندھے سے کندھا ملا کر میرے خاوند کے ساتھ چڑھ بیٹھتی ہے گاڑی میں اور گھومتی پھرتی ہے اکیلی"۔

ہویدا کو محسوس ہوا جیسے اس نے غلط عورت کو ہاتھ ڈال دیا۔ "زیادہ بات کی تو زبان کھنچوا دوں گی"۔

"تجھے پچھے منہ دھو کے آ" دلاور کی بیوی نے ہوا میں ہاتھ نچائے۔

"بڑی احسان فراموش ہو کمینی، میں نے رحم کھا کر تیرے بچوں کو کپڑے دیے ہے"

ہویدا اور زم ہو کر پینترا بدلنے لگی۔

"میرے بچوں کو! اپنے یار کو کوٹ دینے کی خاطر دیے ہوں گے۔ پر تمھیں بتا دوں تیرے اوپر تھوکے گا بھی نہیں میرا خاوند۔ اپنا سینہ دیکھ ڈلا ہوا لوگڑ مال اور یہ دیکھ روئی کا گالا"۔

اس نے سینہ جھلکایا پھر اپنا گریبان پھاڑ ڈالا۔ ہویدا کی حالت قابل رحم ہو گئی۔ بڑی جرأت کر کے کہہ سکی "بے حیا"۔

"بے حیا تم، اپنی کھنچی ہوئی کمانیاں دیکھ"۔

ہویدا نے عاجزی سے نظر پھرا کر دیکھا۔ بھنگی، باورچی اور مشالچی سب باہر آن کھڑے ہوئے تھے۔ ہویدا نے مشالچی سے کہا "جاؤ پولیس کو بلا لاؤ اس کمینی کا دماغ ٹھیک کرا دو"۔

"بلاؤ جلدی بلاؤ۔ میں کہوں گی میرے خاوند سے تعلق ہے تمھارا اور تمھارا کپڑوں کا احسان۔ پچھے"۔

اس نے کپڑوں کو ڈھیر کیا۔ مٹی کا تیل چھڑکا اور آگ لگا دی۔ خود غصے میں آگ بگولا بنی پاس یوں کھڑی ہو گئی جیسے بے نیام تلوار "خدا کرے میرے بچے ننگے پھریں پر تم جیسی کا دیا نہ پہنیں"۔ کپڑے بھڑ بھڑ جلنے لگے اور وہ کوک بھرے کھلونے کی طرح بولتی رہی۔

دلاور جب اسکول سے بچوں کو لے کر آیا تو تانگے میں کباڑ خانہ لد رہا تھا۔ وہ اپنی بیوی کے گستاخانہ سلوک سن کر بڑے غصے میں اپنے کوارٹر کی طرف بڑھا جیسے بیوی کو آج بیٹ ڈالے گا۔ مگر ٹھنڈے قدم واپس آکر بولا "آپ نے میری بیوی کی عزت پر الزام لگایا ہے بیگم صاحب ہم یہاں نہیں رہیں گے۔"

تانگہ ہویدا کے سینے پر مونگ دلتا، کوٹھی کی بجری کو چرچراتا ہوا نکل گیا۔ بچے ہویدا کا منہ تکنے لگے۔ جیسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس تانگے میں اس کی عزت کا دیوالہ پٹ کر نکل گیا۔

عثمان آیا تو ہویدا چپ چپ بیٹھی تھی۔ عثمان نے ہویدا کے اترے ہوئے چہرے کو دیکھ کر پوچھا "تم اس طرح چپ چپ کیوں بیٹھی ہو؟"

ہویدا کی آنکھوں میں آنسو آ گیا۔ اس نے سارا واقعہ سنا ڈالا۔

"اور یہ نوکر کھڑے اس ذلیل عورت کا منہ تکتے رہے۔ انھوں نے اسے کچھ نہیں کہا؟"

ہویدا روہانسی ہو کر بولی "کچھ نہیں۔"

اس نے ہویدا کو سینے سے لگا لیا اور نگاہ اس کی اس راکھ پر جا پڑی جہاں سے چیتھڑے کے سلگنے سے کالے دھوئیں کی بل کھاتی ہوئی لکیر اوپر کو اٹھ رہی تھی۔ جسے دیکھ کر عثمان کے پیٹ کی گٹھڑی میں سے خوشی کا ایک میٹھا میٹھا سا بلبلا پھوٹا۔ وہ تھوڑا سا مسکرایا پھر اس نے ہویدا کا سر چوم لیا اور بولا "دفع کرو۔ تم سمجھو کوئی بات نہیں ہوئی۔"

شہزاد اختر

بات اک رات کی

اس بار جو احمد حسین نے جھکولا کھایا تو اس کا سر ایک دم اسٹیئرنگ ویل سے جا ٹکرایا۔ وہ چونک کر بالکل سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر تک اپنے ماتھے کو دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے رگڑتا رہا پھر کھڑکی سے سر نکال کر آگے پیچھے دور دور تک سڑک پر نظر دوڑائی۔ سڑک بالکل سنسان پڑی تھی۔ کہیں کہیں پول لیمپ جل رہا تھا یا پھر آوارہ کتے گھوم رہے تھے۔ اس نے جھنجھلا کر سر اندر کر لیا اور جیبیں ٹٹولتے ہوئے سوچنے لگا کہ یہ رات یوں ہی گزر گئی تو کل وہ ڈاکٹر کو کیا جواب دے گا۔ کئی دنوں سے تو وہ یہی کہہ کر ٹالتا آرہا تھا کہ کل ضرور انتظام ہو جائے گا۔ مگر انتظام ابھی تک نہ ہو سکا تھا اور اب اگر کل بھی نہ ہو سکا تو ڈاکٹر یقیناً اس کی بیوی کو ہسپتال سے ڈسچارج کر دے گا۔ آج اس نے بالکل صاف صاف کہہ دیا تھا ——— اس نے جیب سے بیڑی نکال کر سلگائی اور سامنے "ایلا کاٹیج" کے مغربی حصے کی طرف دیکھتے ہوئے آہستہ آہستہ کش لینے لگا۔

رات کے تقریباً بارہ بج رہے تھے۔ وہ کوئی ڈیڑھ گھنٹے سے یہاں اندھیرے میں کار روکے بیٹھا تھا۔ مگر ابھی تک کسی خدا کے بندے نے ادھر جھانکی تک نہیں ماری تھی۔ گزشتہ رات جاگنے کی وجہ سے اسے اس وقت بیڑی پینے کے باوجود نیند آرہی تھی۔ اس نے سر کو دائیں بائیں دو تین بار جھٹکے سے ہلایا اور پھر لمبے لمبے کش لینے لگا۔ اسے یقین تھا کہ اگر آج کچھ نہ کر سکا تو پھر شاید کبھی نہ کر سکے۔ کیونکہ آج نہ بیگم گھر میں تھیں نہ صاحب۔ بیگم اپنے لڑکے کے ساتھ میکے گئی ہوئی تھی اور صاحب صبح آنے کا کہہ کر اپنے ایک نئے دوست کے ساتھ جانے کس دوست کے ہاں دعوت پر گئے ہوئے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر کس مصلحت کی بنا پر صاحب آج کار بنگلے ہی پر چھوڑ گیا تھا۔ لیکن یہ سمجھنے کی اسے

ضرورت بھی کیا تھی۔ اسے بس ایک سیدھی سی بات سوجھ رہی تھی اور وہ یہ کہ آج ساری رات کار مکمل طور پر اس کے اپنے قبضے میں تھی اور اسے بس ایسی ہی رات کا انتظار تھا۔ اسے پورا یقین تھا کہ اگر ایسی ایک رات بھی ہاتھ آگئی تو وہ ہسپتال کے بلڈ بینک سے آٹھ اونس کے بجائے سولہ اونس خون خرید سکے گا۔ مگر اب اسے اپنا یہ یقین متزلزل دکھائی دے رہا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ آخر ایک ہی سال میں لوگوں کو کیا ہو گیا ہے۔ ابھی پچھلے ہی برس کی بات تھی جب وہ ٹیکسی چلاتا تھا۔ اسے کسی موٹی آسامی کے لیے اسی سڑک پر بیس پچیس منٹ سے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑتا تھا اور اب تو ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے شہر کے سب شوقین غریب ہو گئے تھے۔ یا پھر اندر سے بھی شریف ہو گئے تھے۔

"ایلا کاٹیج" کے مغربی کمرے میں ابھی تک روشنی ہو رہی تھی۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ جینی ابھی تک اندر موجود تھی۔ جینی اس مکان میں تن تنہا رہتی تھی۔ وہ اسے اپنے ٹیکسی ہی کے زمانے سے جانتا تھا۔ ابھی وہ بی۔ اے کے پہلے ہی سال میں تھی کہ اسے مردوں کا چسکا پڑ گیا اور وہ دھیرے دھیرے رات گئے تک جاگنے اور دن چڑھے تک سونے کی عادی ہوتی چلی گئی۔ کئی بار ہوسٹل کی موٹی تھل تھل سپرنٹنڈنٹ نے راتوں کی غیر حاضری کے سلسلے میں اسے دھمکیاں بھی دیں لیکن وہ باز نہ آئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آخر کار تنگ آکر سپرنٹنڈنٹ نے اسے ہاسٹل سے نکال دیا۔ جینی نے اس کے بعد ہی یہ پانچ کمروں والا اتنا بڑا مکان تین سو روپے ماہوار پر لیا تھا جس کے ماتھے پر دن کی روشنی میں بڑی مشکل سے "ایلا کاٹیج" کے حروف پڑھے جاتے تھے۔ ہوسٹل چھوڑنے کے بعد اس نے کالج بھی چھوڑ دیا تھا۔ آج اس واقعے کو کوئی ڈیڑھ برس کا دھکا لگ رہا تھا اور اس عرصے میں پیشہ کر کر کے جینی کی جوانی ماند پڑنے کے بجائے الٹی اور نکھر آئی تھی۔

احمد حسین پر پھر نیند کا غلبہ ہونے لگا۔ اس نے جماہی لیتے ہوئے کھڑکی سے سر نکال کر پیچھے کی طرف دیکھا۔ اسے کچھ ایسا دکھائی دیا جیسے پچھلے موڑ پر کوئی کھڑا ہو۔ اس نے آنکھیں مل کر اچھی طرح دیکھا۔ پھر جلدی سے گاڑی اسٹارٹ کی اور اسے گھما کر تیر کی طرح پچھلے موڑ کو روانہ ہو گیا۔ مگر جب موڑ کے قریب پہنچا تو اسے بڑی مایوسی ہوئی۔ وہ کوئی موٹا مرغا نہیں تھا۔ اس کے خیال میں اس سے جینی کا معاملہ طے کرنا ایسا ہی تھا جیسے بکری سے بیل گاڑی کھینچنے کو کہا جائے ——— ابھی وہ سوچ

ہی رہا تھا کہ وہ شخص بول پڑا۔

"کیوں بھئی کچھ ہے ؟"

"ہے کیوں نہیں صاحب!" اس نے جلدی سے کہا۔ "مگر پچاس ہوں گے۔"

اس کے ذہن میں افروزہ اور زہرہ کی صورتیں ابھریں، جو صرف پچیس لیتی تھیں۔ اس نے سوچا کہ اس معاملے سے نمٹ کر وہ پھر چینی کی طرف آجائے گا۔

"سہی پچاس!" اس شخص نے جواب دیا۔ "مگر مال اچھا ہونا چاہیے۔"

"بالکل فسٹ کلاس ہوگا صاحب!" اس نے پرانے دلالوں کی طرح جواب دیا اور اندر ہی سے ہاتھ بڑھا کر پچھلا دروازہ کھول دیا۔

اس شخص نے اندر بیٹھ کر دروازہ بند کر لیا اور احمد حسین موٹر کاٹ کر کار کو میونسپلٹی بلڈنگ کی طرف لے چلا۔ وہاں سے تھوڑے فاصلے پر افروزہ رہتی تھی اور اس سے ذرا آگے زہرہ کا گھر تھا —— آج پورے ایک برس بعد وہ یہ پہلا کسٹمر لے جا رہا تھا۔ ایک برس پہلے جب وہ ٹیکسی چلاتا تھا اس نے بے شمار روپے کمائے تھے لیکن جس طرح کمائے تھے اسی طرح اڑا بھی دیے تھے۔ اور کمانے اور اڑانے کا یہ سلسلہ زوروں پر تھا کہ یکایک ایک بھولی بھالی سی لڑکی آندھی کی طرح اس کی زندگی میں در آئی اور تب اسے یکایک محسوس ہوا جیسے وہ اب تک بیچ بازار میں ننگا ناچ رہا تھا۔ اسے اپنی حالت پر شرم آگئی۔ اس نے کان پکڑے توبہ کی اور شرافت کا جامہ پہن کر اس لڑکی سے شادی کر لی —— اور اب وہ لڑکی ہسپتال میں تھی۔ وہ پیٹ کے ایک مہلک مرض میں مبتلا تھی۔ ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ وہ بغیر آپریشن کے نہیں بچے گی اور آپریشن بغیر خون دیے نہیں ہو سکتا۔ احمد حسین نے اپنا خون دینے کی پیش کش کی تھی۔ لیکن ڈاکٹر نے کہا کہ وہ تو پہلے ہی ہینگ بگ رہا ہے۔ خون دینے کے بعد تو اس کی اپنی زندگی بھی خطرے میں پڑ جائے گی اور یہ سن کر اس کی بیوی رونے لگی تھی اور اس سے ہاتھ جوڑ کر منت کی تھی کہ وہ اپنا خون نہ دے۔ بلا سے اس کی اپنی جان جائے تو جائے۔ پگلی! —— پھر اس نے ڈرتے ڈرتے صاحب سے کچھ روپے ایڈوانس مانگے اور تھوڑی تھوڑی رقم ماہانہ اپنی تنخواہ میں سے کاٹ لینے کو کہا۔ لیکن اس نے روپے دینے

سے انکار کر دیا کیونکہ اس سے پہلے والا ڈرائیور اسی طرح ایڈوانس لے کر بھاگ چکا تھا۔ اور اب اس کے سامنے ایک ہی راستہ تھا۔ وہ راستہ جس پر وہ اس وقت جا رہا تھا۔

آدھی رات کی سنسان سڑکوں پر کار ساٹھ میل کی رفتار سے بھاگ رہی تھی اور احمد حسین کے ذہن کی سڑک پر خیالات بھی اسی رفتار سے بھاگ رہے تھے۔ سڑکیں ویران ہونے کی وجہ سے دن کی بہ نسبت زیادہ کشادہ لگ رہی تھیں۔ ایکسیڈنٹ کا کوئی خطرہ نہ تھا۔ لہذا وہ ادھر سے بالکل مطمئن ہو کر دوسری بہت سی باتیں سوچ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا ان روپیوں کے متعلق جو صبح تک اس کی جیب میں ہوں گے۔ اس خون کے متعلق جو اس کی بیوی کے جسم میں داخل کیا جائے گا۔ اس نرم و نازک جسم کے متعلق جس پر آپریشن کا بے رحمانہ عمل کیا جائے گا۔ اس آپریشن کے متعلق جو خون کی کمی دور کیے بغیر ناممکن تھا۔ اس ڈاکٹر کے متعلق، اس کی بیوی جس کے زیر علاج تھی۔ اس نرس کے متعلق جو سفید کپڑوں میں اندھیری رات کی طرح کالی لگتی تھی اور جس کی مسکراہٹ صبح کی روشنی سے بھرپور تھی۔ اس بھنگی لڑکے کے متعلق جو اس نرس کو دیکھ کر بڑے خلوص سے مسکراتا تھا۔ اس مالک مکان کے متعلق جو سرے سے مسکراتا ہی نہ تھا۔ اس کرائے کے متعلق جو پابندی سے اسے ہر ماہ مالک مکان کو دینا پڑتا تھا۔ اس تنخواہ کے متعلق جو اسے مہینہ بھر کار کے دروازے کھولنے اور بند کرنے کے صلے میں اسی روپے کی صورت میں ملتی تھی ...... "چیانگ کیں" یکایک ایک کتا کار کی لپیٹ میں آگیا اس نے جلدی سے پورا بریک لگایا اور کتے کی تیز چیخ بریک کی لمبی "چوں" کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر خواب آلود خاموشی کا سینہ چیرتی چلی گئی۔ چند ثانیوں تک اس کی بازگشت فضا میں تھرتھرائی اور پھر ڈوب گئی۔ جیسے کسی زخمی پرندے نے آخری بار پھڑک کر دم توڑ دیا ہو۔ احمد حسین نے کھڑکی سے سر نکال کر دیکھا۔ پول لیمپ کی دھندلی روشنی میں پائیدان کے نیچے ہی کتے کا آدھا دھڑ پھڑکتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

"کیا ہوا؟" پچھلی سیٹ سے آواز آئی۔

"کچھ نہیں۔ سالا کتا تھا۔" وہ قدرے جھنجھلایا ہوا سا بولا "موت کتنی سالے کی!"

پھر وہ کار اسٹارٹ کرنے ہی والا تھا کہ اس کی نظر سامنے والے فلیٹ پر پڑی۔ ارے!

یہ تو افروزہ کا فلیٹ ہے۔ اسے یقین نہیں آیا کہ میونسپلٹی کی اتنی شاندار عمارت اس کی نگاہوں میں آئے بغیر بھی پیچھے رہ سکتی ہے۔ کہیں وہ کسی اور فلیٹ کو تو افروزہ کا فلیٹ نہیں سمجھ رہا ہے۔ اپنے اطمینان کے لیے اس نے پھر سر نکال کر پیچھے کی طرف دیکھا۔ کوئی پچاس گز کے فاصلے پر میونسپلٹی کی پرشکوہ عمارت اپنے گیٹ پر کے برقی قمقموں کی روشنی میں آنکھیں جھپکائے ہوئے سی کھڑی تھی اور جب اسے یقین ہو گیا کہ یہ افروزہ ہی کا فلیٹ ہے تو اس نے تھوڑے تھوڑے وقفے سے تین بار ہارن بجایا لیکن اندر سے نہ کسی نے جھانکا نہ کوئی جواب ملا۔

"اب پتہ نہیں سالی زہرہ بھی ہوگی یا نہیں!" اس نے زیر لب بڑبڑاتے ہوئے کار اسٹارٹ کی اور آگے بڑھ گیا۔

اس کے اندیشے کے مطابق زہرہ بھی باہر تھی۔ وہ شش و پنج میں پڑ گیا کہ اب اپنے کسٹمر کو کیا جواب دے۔ لیکن جواب تو اسے بہر حال دینا ہی تھا۔ لہذا وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔

"صاحب پچاس والی تو دونوں چیزیں باہر ہیں۔"

"تب؟" کسٹمر کے لہجے میں اس کے بدلے ہوئے تیور کی جھلک تھی۔ جیسے کہہ رہا ہو۔ تب تو تم نے مفت میں پریشان کیا نا۔ اس سے تو اچھا تھا کہ میں کسی اور کے ساتھ چلا جاتا۔

"ایک اور چیز ہے میرے پاس —— لیکن اس پر بہت زیادہ خرچ آئے گا — یعنی ڈیڑھ سو۔" احمد حسین نے اپنے کمیشن کے پچاس شامل کر کے کہا۔

"میں کہہ رہا ہوں کہ کوئی اچھی سی چیز دلاؤ اور تم ہو کہ میرے روپے خرچ ہونے کے غم میں مرے جا رہے ہو۔" وہ کسی قدر جھلا گیا۔ "ایسی ہی ہمدردی ہے تو چلو اپنا کمیشن چھوڑ دینا۔"

"صاحب کمیشن ہی پر تو ہم لوگ جیتے ہیں۔" وہ خالص تجارتی انداز میں مسکرا کر بولا۔ "اگر یہی چھوڑ دیں تو کھائیں گے کہاں سے —— وہ تو میں نے یونہی کہہ دیا تھا کہ شاید...... مگر اب آپ کہتے ہیں تو چلیے میں آپ کو دو سو میں ایک ایسی چیز دلا دوں کہ عمر بھر یاد کریں گے۔" اس نے دل ہی دل میں جینی کے سودے پر اپنا کمیشن پچاس سے سو کر لیا۔

"لیکن ایسا نہ ہو کہ وہاں پہنچو تو وہ بھی باہر جا چکی ہو۔ اگر ایسا ہوا تو میرا ہزار دوں

روپے کا نقصان ہو جائے گا۔ سمجھے !"

اور کار اسٹارٹ کرتے ہوئے احمد حسین نے سوچا کہ سالا باہر سے تو بلی معلوم ہوتا ہے لیکن اندر سے پورا ہاتھی ہے۔

"ایلا کاٹج" کے مغربی کمرے میں ابھی تک روشنی ہو رہی تھی۔ اس نے احاطے کے موڑ پہ موٹر روک کر تھوڑے تھوڑے وقفے سے تین بار ہارن بجایا۔ تھوڑی دیر بعد کھڑکی سے ایک شانوں تک ترشے ہوئے بالوں والا سر برآمد ہوا —— یہ جینی تھی۔

"میں غلام علی ہوں۔" اس نے ٹیکسی کے زمانے کی طرح اپنا غلط نام بتاتے ہوئے کہا۔ "آپ ذرا جلدی سے تیار ہو کر آجائیے۔

جینی اندر چلی گئی —— اور پھر کوئی پندرہ منٹ بعد گیٹ پر برآمد ہوئی۔ احمد حسین نے گاڑی سے اتر کر پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔ جینی آکر کسٹمر کے ساتھ بیٹھ گئی تو وہ دروازہ بند کر کے اپنی سیٹ پر آبیٹھا۔

"ہاں صاحب کہیے کس طرف چلوں۔"

اس نے کار اسٹارٹ کی اور پھر بتائے ہوئے پتے کی طرف چل پڑے۔

کوئی آدھ گھنٹہ بعد کار شہر کے باہر ایک کم آباد علاقے میں ایک چھوٹی سی دو منزلہ عمارت کے سامنے رکی۔ کسٹمر نیچے اترتے ہوئے احمد حسین سے بولا۔

"دیکھو تم صبح منہ اندھیرے آجانا سمجھے !"

"بہت اچھا صاحب۔"

وہ جینی کو لے کر احاطے کے گیٹ میں داخل ہو گیا اور احمد حسین سوچنے لگا کہ اب وہ کدھر جائے۔ اس وقت اس کا جی چاہ رہا تھا کہ کہیں جا کر آرام سے پاؤں پھیلا کر سو رہے۔ لیکن اس نے اپنی اس خواہش کا بے دردی سے گلا گھونٹ دیا۔ کیونکہ اگر وہ کہیں جا کر سو رہتا تو پھر یقیناً صبح منہ اندھیرے یہاں حاضر نہ ہو سکتا۔ اگر معاملہ ٹیکسی کا ہوتا تو کوئی بات نہ تھی۔ لیکن یہ پرائیویٹ کار تھی۔ دن کی روشنی میں پہچان لیے جانے کا اندیشہ تھا۔ اس نے سوچا کیوں نہ یہیں بیٹھ کر انتظار

کیا جائے۔ اس علاقے میں کافی فاصلے پر دو منزلہ سہ منزلہ عمارتیں تھیں۔ سڑک پر کہیں کہیں پول لیمپ اونگھ رہے تھے۔ اور یہاں سڑک کے اس حصے میں تو بالکل ہی اندھیرا تھا۔ شاید سامنے والے کھمبے کا بلب پھوٹ گیا تھا یا پھر فیوز ہو گیا تھا —— ہاں ٹھیک ہے! اس نے یہیں رک کر انتظار کرنے کا فیصلہ کیا اور دونوں پاؤں پھیلا کر سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا لیا۔

بیٹھے بیٹھے رات کا پچھلا پہر آ گیا۔ احمد حسین نیند کو بھگانے کے لیے بیڑی سے بیڑی سلگا کر پھونکتا رہا، سوچتا رہا اور اپنے آپ کو اس بات کا یقین دلانے کی کوشش کرتا رہا کہ صبح کو جو روپے اس کی جیب میں آئیں گے وہ کیوں حلال نہیں ہوں گے جبکہ اس نے سن رکھا تھا کہ سخت مجبوری کی حالت میں سور بھی حلال ہے۔ اس کی اپنی مجبوری بھی کوئی معمولی مجبوری نہ تھی۔ بہت ہی لطیف اور پاکیزہ زندگی۔ اسی کی وجہ سے اسے پہلی بار احساس ہوا تھا کہ ٹیکسی ڈرائیوروں کی زندگی کتنی ذلیل اور گھناؤنی ہوتی ہے۔ اسی کی وجہ سے اس کے دل میں پہلی بار پاک صاف خواہش جاگی تھی۔ اور اب اسی کی زندگی پر موت اپنا بھیانک سایہ ڈال رہی تھی۔ یہ اس کی اپنی زندگی کا کتنا بڑا المیہ تھا، اس کا اندازہ کچھ وہی کر سکتا تھا اور اس المیے سے چھٹکارا پانے کے لیے وہ جو کچھ بھی کرتا اس کے نزدیک سب جائز تھا۔

رات آہستہ آہستہ رینگتی ہوئی صبح کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اب اس کے پاس بیڑیوں کا اسٹاک ختم ہو چکا تھا۔ اور موقع غنیمت دیکھ کر نیند نے اس پر زوروں کا دھاوا بول دیا تھا۔ وہ بڑی مشکلوں سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اور ہونٹ چبا چبا کر اس کا مقابلہ کر رہا تھا۔ جماہیوں پر جماہیاں اور انگڑائیوں پر انگڑائیاں آ رہی تھیں اور منہ سے بیڑی کی بو ملی ہوئی بدبو نکل نکل کر ناک میں گھسی جا رہی تھی۔ اس نے نیند کے غلبہ سے منہ میں آ کر جمع ہو جانے والی رال کو سڑک پر تھوکتے ہوئے سوچا۔ بس تھوڑی دیر اور پھر وہ زور سے ہارن بجائے گا اور اس کے بعد اس کی مٹھی میں دو سو کے چرمراتے ہوئے نوٹ ہوں گے —— سو جینی کے اور سو اس کے اپنے۔

آسمان پر ننھے ننھے تارے بجھ چکے تھے۔ صرف بڑے بڑے تارے پلکوں پر آئے ہوئے موٹے موٹے آنسوؤں کی طرح لرز رہے تھے —— اس نے پاؤں ذرا اور پھیلا دیئے اور سیٹ کی پشت پر سر ٹکا کر کھڑکی سے باہر تاروں کو گھورنے لگا —— بس تھوڑی دیر اور..... تھوڑی دیر اور...

تھوڑی دیر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کا ذہن کسی بہت بڑے ہال کی طرح گونج رہا تھا۔ رات جا رہی تھی صبح آ رہی تھی اور تارے بے تحاشا لرز رہے تھے ـــــ تارے لرزتے رہے۔ لرزتے رہے اور پھر وہ یکایک ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے۔ ان سے بے تحاشا چنگاریاں جھڑنے لگیں۔ وہ ایک دم سہم گیا۔ یہ کیا ہو گیا؟ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ مگر نہیں یہ تو اولے پڑ رہے ہیں۔ اولے ہی تو ہیں۔ سفید سفید گول گول ـــ آں نہیں ـــ یہ تو پانی کے موٹے موٹے قطرے ہیں۔ ہاں یہ تو پانی برس رہا ہے ـــ اور پھر اس نے دیکھا کہ میٹر کی سوئی سو پر تھرتھرا رہی ہے۔ مگر کار اپنی جگہ سے ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھتی۔ چاروں طرف بے کراں سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ اوپر بادل ہیں نیچے پانی اور پانی کے اوپر کار اور کچھ نہیں ـــ ہاں اور کچھ نہیں ـــ مگر یہ داہنی طرف کیا ہے؟ دیکھنے میں جہاز سا لگتا ہے لمحہ بہ لمحہ بڑا ہوتا جا رہا ہے۔ بڑی تیزی سے اسی سمت بڑھ رہا ہے۔ یہ اسی سمت کیوں آ رہا ہے؟ اور یہ کیسا جہاز ہے؟ سامنے کا حصہ لگتا ہے جیسے بہت بڑا منہ کھلا ہوا ہو۔ ارے یہ تو سچ مچ کا منہ ہے ـــ ارے باپ رے! گھڑیال، جہاز اتنا بڑا گھڑیال! اس نے جلدی سے دروازہ کھول کر پانی میں کود جانا چاہا۔ مگر اسی وقت کار چل پڑی۔ ایک دم سو میل کی رفتار سے۔ گھڑیال منہ پھاڑے اور آنکھیں بند کیے کار کے پیچھے سے نکل گیا اور کار تیر کی طرح آگے ہی آگے بڑھتی چلی گئی۔ بہت دور جا کر اس نے کار روکنی چاہی تو معلوم ہوا کہ وہ کشتی میں بیٹھا ہے۔ پھر اسے بہت قریب ہی ساحل نظر آیا۔ کشتی جوں جوں ساحل کی طرف بڑھتی گئی اس کی رفتار کم ہوتی گئی۔ پھر اس کے کانوں میں "چرر چرر" کی آواز آنے لگی۔ اس نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا۔ کہیں کچھ نہ تھا۔ معاً اسے خوف محسوس ہوا کہ کہیں گھڑیال پانی کے نیچے ہی نیچے نہ آ رہا ہو اور ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ عین کشتی کے سامنے وہی گھڑیال ابھرا۔ اس کے ابھرنے سے پانی میں ایسی آواز ہوئی جیسے آہنی گیٹ کھڑکھڑایا ہو۔ کشتی بہت زور زور سے ڈگمگانے لگی اور اب اس کے منہ سے چیخ نکلنے ہی والی تھی کہ آنکھ کھل گئی۔

"ارے تم کب سے آئے بیٹھے ہو؟ ـــ اطلاع کیوں نہیں دی؟"

احمد حسین نے کسٹمر کی آواز پہچان کر احاطے کے آہنی گیٹ کی طرف دیکھا جہاں اندھیرے میں ایک انسانی ہیولا کھڑا دکھائی دے رہا تھا۔

"بس صاحب اب تو میں کار بجانے ہی والا تھا ــــــ یعنی ہارن" وہ گڑبڑا کر جلدی سے بولا۔

"اچھا تو تم گاڑی گھما کر رکھو میں ابھی آتا ہوں" وہ بجریوں پر "چر چر" کی آواز پیدا کرتا ہوا اندر چلا گیا۔

اس نے کار گھما کر اس کا رخ آبادی کی طرف کر لیا۔

تھوڑی دیر بعد گیٹ پر چار سائے نمودار ہوئے۔

"میں اسے کہے دیتا ہوں" کسٹمر کہہ رہا تھا" وہ آپ لوگوں کو کبھی چھوڑ آئے گا"

"مگر یار آج تم نے طبیعت خوش کر دی۔ کیا غضب کی چیز لائے خدا کی قسم" ایک سائے نے دوسرے سائے سے لپٹ کر چٹاخ سے اس کا بوسہ لیا۔

احمد حسین کو لگا جیسے اس نے یہ آواز پہلے کبھی سنی ہے۔ مگر کہاں؟ ــــــ وہ سوچ ہی رہا تھا کہ کسٹمر کی آواز سنائی دی۔

"ارے جناب ابھی تو آپ نے یہی چیز دیکھی ہے۔ اس سے بھی بڑھیا چیز آسکتی ہے۔ بس ذرا وہ ہمارا کیس ٹھیک ہو جائے"

"بس! ــــــ" بوسہ لینے والے کی آواز آئی" وہ بھی ہو جائے گا!"

"ہاں ہاں کیوں نہیں ــــــ لیکن ہمارے یہاں آنے کی کسی کو خبر نہ ہو۔ اسی لیے میں کار نہیں لایا"

"ہیں! یہ ...... یہ تو ......" آخری آواز پگھلا ہوا سیسہ بن کر احمد حسین کے کانوں میں اتر گئی۔ اسی پل اس نے بوسہ لینے والے کی آواز بھی پہچان لی ــــــ دوسرے لمحے میٹر کی سوئی ساٹھ پہ تھر تھرا رہی تھی اور کار آبادی کو جانے والی سڑک پر ہوا کی طرح اڑی جا رہی تھی۔

مخدوم محی الدین

وقت — بے درد مسیحا

درد کی رات ہے
چپ چاپ گزر جانے دو
درد کو مرہم نہ بناؤ
دل کو آواز نہ دو
نورِ سحر کو نہ جگاؤ
زخم سوتے ہیں تو سو رہنے دو
زخم کے ماتھے سے امرت بھری انگلی نہ ہٹاؤ
دل کو آرام، پھپولوں کو سکوں ملتا ہے

وقت بے درد مسیحا ہے
بہ یک حکم، جگا دیتا، جلا دیتا ہے
قبر سے اٹھ کے نکل آئی ملاقات کی شام
ہلکا ہلکا سا دہ اڑتا ہوا گالوں کا گلال
بھینی بھینی سی وہ خوشبو کسی پیراہن کی

شب کے سناٹے کے جادو نے کمندیں پھینکیں
گوشۂ دل کے کسی چاک میں لپٹی ہوئی
حسرت نے جو انگڑائی لی
خواہشیں رنگیتی پھرتی نظر آئی ہیں کمینگا ہوں میں
کوئی یوسف، نہ زلیخا
یہ وہ محمل ہے، یہ رات
درد کی کاہکشاں ہے کہ صلیبوں کی برات
رات اِک ساقیٔ بے فیض کی مانند گزرتی ہے
گزر جانے دو
وقت
او مشفق و محسن قاتل!
رات کی نبض میں نشتر رکھ دے
رات کا خون ہے
بہہ جاتا ہے
بہہ جانے دو

فیض احمد فیض

ملاقات مِری

ساری دیوار سیہ ہوگئی تا حلقۂ بام
راستے بجھ گئے رخصت ہوئے رہ گیر تمام
اپنی تنہائی سے گویا ہوئی پھر رات مری
ہو نہ ہو آج پھر آئی ہے ملاقات مری
اک ہتھیلی پہ حنا، ایک ہتھیلی پہ لہو
اک نظر زہر لیے، ایک نظر میں دارو

دیر سے منزلِ دل میں کوئی آیا نہ گیا
فرقتِ درد میں بے آب ہوا تختۂ داغ
کس سے کہیے کہ بھرے رنگ سے زخموں کے ایاغ
اور پھر خود ہی چلی آئی ملاقات مری
آشنا موت جو دشمن بھی ہے غمخوار بھی ہے
وہ جو ہم لوگوں کی قاتل بھی ہے دلدار بھی ہے

اختر الایمان

جب اور اب

کہاں تو یہ تھا کہ میری چاہت میں گدگدی سی تھی لوریوں کی
نئی نئی کونپلوں کی نرمی نئے شگوفوں کی تازگی تھی
کہاں تو یہ تھا کہ میری چاہت تھی گیت، اٹھتی جوانیوں کا
کہاں یہ دن ہے کہ تیری آواز بن گئی ہے، صدائے صحرا
نہ جانے کس گوشۂ زمیں سے رکی رکی سی تھمی تھمی سی
گھٹی گھٹی سی ہزار پردوں سے آج چھن چھن کے آرہی ہے

اتفاق

دیارِ غیر میں کوئی جہاں نہ اپنا ہو
شدید کرب کی گھڑیاں گزار چکنے پر
کچھ اتفاق ہو ایسا کہ ایک شام کہیں
کسی اک ایسی جگہ سے ہو یونہی میرا گزر
جہاں ہجومِ گریزاں میں تم نظر آجاؤ
اور ایک ایک کو حیرت سے دیکھتا رہ جائے!

سردار جعفری

سو رنگ

اس محفلِ صد رنگ میں سو رنگ ہیں میرے
ہر رنگ میں رقصاں ہوں گلستانِ جہاں میں
خوشبو کی طرح کاکلِ پیچاں کی گلی میں
شعلے کی طرح انجمنِ شعلہ رُخاں میں
شمشیر بکف لشکرِ اعدائے وطن میں
پیمانہ بکف محفلِ پیمانہ کشاں میں
تلوار کے آغوش میں فولاد کے مانند
تیشے کی طرح کارگہِ شیشہ گراں میں
نشتر کی طرح نیز دلِ اہلِ ہوس میں
مانندِ شررِ گرم رگِ سنگِ گراں میں
کانٹے کی طرح دیدۂ اربابِ ستم میں
سرمے کی طرح چشمِ حسینانِ جہاں میں
خورشیدِ جہاں تاب کا ساغر بھی پگھل جائے
وہ آتشِ سیال ہے پیمانۂ جاں میں
بتخانۂ عالم میں ہوں مصروفِ پرستش
جس طرح برہمن ہو کوئے بُتاں میں

جامِ محبّت

بزمِ احباب ہے، پیمانۂ گلرنگ اُٹھائیں
شکوۂ جور و جفا غرقِ مئے ناب کریں
چشمِ پُرآب کے زہراب کو ہنس کر پی جائیں
اشکِ انگور سے پیمانوں کو خوناب کریں
بادۂ سرخ کے خورشیدِ درخشاں کو جگائیں
آج ہر ساغرِ بلّور کو مہتاب کریں
ایک ہی گھونٹ میں چہروں کے کنول کھل جائیں
رات کے سیلِ سیہ رنگ کو شاداب کریں
پیاس ہے دشتِ جگرتاب میں دل جلتا ہے
دوستو آؤ علاجِ دلِ بے تاب کریں
لطف تو جب ہے کہ ٹوٹے ہوئے دل جڑ جائیں
آج اس طرح سے کچھ خاطرِ احباب کریں
چند جام اور ابھی رُوح کے تر ہونے تک
چند جام اور شبِ غم کی سحر ہونے تک

احمد ندیم قاسمی

یہ عجب شب ہے

یہ عجب شب ہے کہ روشن بھی ہے تاریک بھی ہے
اتنی روشن ہے کہ دن اس کے مقابل شب ہے
اور تاریک بھی اتنی کہ ترے دھوکے میں
میں نے چند اور حسیناؤں کے لب چوم لیے

اتنی روشن کہ مرے پیار کے اس پار مجھے
جتنے چہرے نظر آئے، مرے اغیار کے تھے
اتنی تاریک کہ ان چہروں میں ہر چہرے پر
مجھے خود اپنے ہی چہرے کے گماں گذرے تھے

میں ترے پاس رہا، پھر بھی بہت دُور رہا
آج میں نے ترا ایک اور بھی پہلو دیکھا

بہار

اتنی خوشبو ہے کہ دم گھٹتا ہے
اب کے یُوں ٹوٹ کے آئی ہے بہار
آگ سی جلتی ہے کہ کھلتے ہیں چمن
رنگ سا شعلہ ہے تو نکہت ہے شرار
روشوں پر ہے قیامت کا نکھار
جیسے تپتا ہو جوانی کا بدن
آبلہ بن کے تپکتی ہے کلی
کونپلیں پھوٹ کے لَو دیتی ہیں
اب کے گلشن میں صبا یوں بھی چلی

سلام مچھلی شہری

صبحِ امن

بہارِ امن کی دیوی کی آمد آمد ہے
خوشی کا پرچمِ زریں فضا میں لہرا دو
سہانی شمعوں، شگفتہ ترین گلابوں سے
خیال و فکر کے سب معبدوں کو مہکا دو

ہمیں نے ظلمتِ دوراں پہ فتح پائی ہے
نئی سحر کے پیمبر بھی اب ہمیں ہوں گے
جبینِ چرخ جھکے گی زمیں کے قدموں پہ
ہمارے پھول ستاروں سے بھی حسیں ہوں گے

مزا جب آئے کہ دورِ شباب گیتی میں
تصوّراتِ بہاراں بھی کچھ بدل جائیں
جو جھانکتے ہیں زر و سیم کے مناروں سے
وہ کردگار، وہ یزداں بھی کچھ بدل جائیں

یہ صبحِ تازہ مبارک ہو امن والوں کو
بہت سنبھال کے رکھنا ہے ان اجالوں کو

عبدالحمید عدم

خم کدہ

یہ کون نازنیں ہے جو اتنی دلبری ہے
میخانۂ ازل میں ہم کو بلا رہا ہے
قائم ہیں روشنی کی دو سرمدی لکیریں
اک جام جا رہا ہے اک جام آ رہا ہے

ہماری خیر و خوبی کو گھٹانے کا تہیہ ہے
اور اپنی شان و شوکت کو بڑھانے کا ارادہ ہے
ارے او صوفیو! او پارساؤ! او ریاکارو!
عبادت سے خدا کو ورغلانے کا ارادہ ہے

بت شکن ہوں رسومِ باطل کا
یہ مرا نام و ننگ ہے ساقی
ہاتھ میں مے کا جام ہے تو کیا
دوش پر طبلِ جنگ ہے ساقی

ظہور نظر

سچا جھوٹ

کون کہتا ہے، ہوا بے رنگ ہے؟
کون کہتا ہے، کہ رنگوں کی نہیں کوئی صدا؟

شام کی مدھم ہوا نے آج، جب
اس کے رخساروں کو چوما، اس کے آنچل کو چھوا
اور اس نے مسکرا کر اپنا سر
میرے سینے سے لگایا، میرے شانوں پر دھرا
میں نے دیکھا
اس گھڑی رنگِ ہوا
آرزو کی قوس کے مانند گہرا سرخ تھا

اور جب میرے بدن کے لمس سے
اس کا آنچل اس کے شانوں سے گرا
رنگ پائل کی طرح چھنکے، ہوا نے تال دی
گنگنا اٹھی شفق، بولا افق، ناچی فضا
دل کی ہر دھڑکن پکھاوج کی طرح بجنے لگی
روح کا ہر راگ رنگوں کی صدا سے بھر گیا

کون کہتا ہے، ہوا بے رنگ ہے؟
کون کہتا ہے کہ رنگوں کی نہیں کوئی صدا؟

شاذ تمکنت

جذب و گریز

رو برو ہو کے بھی نظریں نہ ملائیں اُس نے
اپنی روئی ہوئی آنکھوں کو چھپانا چاہا
ہائے وہ کیفیتِ جذبۂ ہنگامِ سلام
اس سرافراز نے جب سر کو جھکانا چاہا
سیپ سی انگلیاں تھرائیں، جبیں سرد ہوئی
جیسے سر تا بقدم مجھ میں سمانا چاہا
زیرِ دامانِ حیا، شمع جلانی چاہی
ناز فرماتے ہوئے ناز اٹھانا چاہا
شکن لطف کو سرگوشی کا درجہ دے کر
تا بہ امکاں مجھے نزدیک بلانا چاہا

لیلئ نجد دکن، جانِ وطن، روحِ سخن
غم کو مہمل نہ سمجھ، عشق کو پروانہ بنا
مہر کو چور نہ کر، ماہ کو بے نور نہ کر
نیند کو زخم نہ دے، خواب کو دھڑکا نہ بنا
لحن کو سوز نہ دے، ساز پہ مضراب نہ رکھ
سانس کو آہ نہ کر، فکر کو نغمہ نہ بنا
روپ کو دھوپ نہ دے، رنگ کو شعلہ نہ دکھا
در کو دیوار نہ کر، سنگ کو شیشہ نہ بنا
تو، کہ خلوت میں رہے انجمن آرا بن کر
مجھ کو بازار ہی رہنے دے، تماشا نہ بنا

احسن احمد اشک

رقص

جیسے تخلیقِ جہاں کا ذہنِ یزداں میں خیال
چاندنی میں جیسے سہمیں آبشاروں کا جمال
جیسے مستی میں شرابی جیسے لرزش میں شراب
زینۂ مشرق پہ جیسے لڑکھڑائے آفتاب
کالی کالی بدلیوں میں جیسے کوندے کی لپک
نرم جھونکوں سے ہوا کے جیسے کھیتوں میں لچک
نیند کے عالم میں جیسے دُور بجتا ہو ستار
دھوپ اور بدلی میں جیسے ہلکی ہلکی سی پھوار
جیسے اک منظوم بے ربطی نوائے عشق میں
جیسے دھڑکن دو دلوں کی ابتدائے عشق میں
بین کی آواز پر جیسے ہو ناگن جوش میں
حسن کی انگڑائی جیسے عشق کے آغوش میں
جیسے ہیجانِ تمنا نبضِ محسوسات میں
ندیاں چڑھتی ہوئی جیسے بھری برسات میں

الغرض ہیں منفعل فکرِ رسا کے حوصلے
اشک تیرے رقص کو کس چیز سے تشبیہہ دے

بے گناہی

کالی کالی بدلیاں بھیگی ہوئی برسات کی
لے رہی تھیں چرخ پر انگڑائیاں کل رات کو
پڑ رہی تھیں ننھی ننھی نشہ آور بوندیاں
رقص کرتی تھیں فضا میں مستیاں کل رات کو
عقل تھک کر سو گئی تھی تلخیٔ افکار سے
دل پہ بھی طاری تھیں کچھ بیہوشیاں کل رات کو
نا امیدی تھی بساطِ شوق پر پھیلی ہوئی
آرزوئیں ہوتی جاتی تھیں جواں کل رات کو
دل جواں جذبے جواں آنکھیں جواں فطرت جواں
ساری دنیا تھی نگاہوں میں جواں کل رات کو
تھی حجابِ ناز میں ترکیبِ آغوشِ نیاز
دیدنی تھیں حسن کی انگڑائیاں کل رات کو
عشق کے ہونٹوں پہ اک ہلکی سی جنبش کے لئے
ملتجی تھیں حسن کی رعنائیاں کل رات کو
دو دھڑکتے دل کہانی کہہ رہے تھے شوق کی
خامشی تھی داستاں در داستاں کل رات کو
پھیلتا جاتا تھا کاجل عارضِ گل رنگ پر
مدبھری آنکھوں سے تھے آنسو رواں کل رات کو

اشک لیکن باوجودِ ارتباطِ جسم و جاں
تھا گناہوں پر تقدس حکمراں کل رات کو

انوار انجم

اِک بُوند لہو کی

یوں بھی ہوتا ہے کہ دریاؤں کے سوکھے ہوئے لب
خود ہی سیلاب کی لہروں میں نہا جاتے ہیں
یہ بھی دیکھا ہے کہ مرجھائی ہوئی ٹہنی پہ
پھول لگتے ہیں تو لگتے ہی چلے جاتے ہیں

ہم جو تاریک جزیروں میں پلے ہیں ہم نفسو
جال بن جائے گی بڑھتے ہوئے سایوں کی لکیر
ذہن کھینچے گا وہ سنگین فصیلیں جن پر
روشنی آئے تو سر پھوڑ کے واپس ہو جائے
چاند ابھرے بھی تو گہنایا ہوا سا ابھرے

اپنی ہی ذات میں تعمیر نہ کیجے یہ حصار
آپ ہی گھر پہ بٹھائیں نہ خزاں کا پہرہ
کھڑکیاں کھول کے رکھیں کہ کوئی موجِ صبا
کیا خبر بھولی بھٹکتی اسی در سے گزرے

شہریار

ایک دو جام

ایک دو جام اور آج کی شام
دیکھو وہ سامنے کھڑی ہے رات

اے اسیرانِ گردشِ ایام

رات کے بعد صبح آئے گی
صبح کے بعد دوپہر اور شام
اور پھر رات
اک بھیانک رات
ایک دو جام اور آج کی شام

افتخار اعظمی

رہنما

اس گذرگاہ زمانہ کے قریب
روز مردانِ وفا
سر بکف آبلہ پا
اپنے جسموں پہ سجائے ہوئے زخموں کی قبا
تاج پہنے ہوئے کانٹوں کا بصد شان و شکوہ
اپنے کاندھے پہ لئے اپنی صلیب
اپنے سینے میں غمِ دہر کا گلزار لئے
اپنی آنکھوں میں سرورِ مئے کردار لئے
جرأت و شوخیٔ گفتار لئے
زہر کا جام پیے

شام ہوتی ہے تو اک جشن بپا کرتے ہیں
گنگناتی ہے وفا کی زنجیر
رقص کرتی ہوئی اٹھتی ہے صلیبوں کی قطار
آبلے چھیڑتے ہیں دشتِ وفا کا قصہ

زہر کے جام میں بھر جاتی ہے یادوں کی شراب
تاج کانٹوں کا مہکتا ہے بہاروں کی طرح
سر چمکتے ہیں ستاروں کی طرح
سینۂ شب میں شراروں کی طرح

اور ایسے میں جو کوئی رہرو
شاہراہِ غمِ ہستی سے بھٹک جاتا ہے
یہ شہیدانِ وفا
سر بکف آبلہ پا
گنگناتے ہوئے لہجے میں صدا دیتے ہیں
راہ بھولے ہوئے راہی کو بتا دیتے ہیں

میری شاعری پر انگریزی ادب کا اثر

انگریزی تہذیب کے فقرے سے ہم بجا طور پر مغربی تہذیب مراد لیتے ہیں۔ یعنی یورپ اور امریکہ کی تہذیب۔ ایشیا پر اور خاص کر ہندوستان پر اب سے دو سو برس پہلے اس مغربی تہذیب و تمدن کا اثر پڑنا شروع ہو گیا تھا جس کی نمائندگی انگلستان کر رہا تھا۔ منفی پہلو یا منفی پہلو کے پردے میں ایک اثباتی پہلو اس کا اثر یہ تھا کہ شخصی حکومت اور سامنتی مشرقی تہذیب و تمدن کے تصور کا ہمارے ذہنوں پر تسلط کمزور پڑتا گیا۔ دوسرا اثر جو انگریزی حکومت نے ہمارے شعور پر ڈالا وہ مشینی دور کی عظمت و اہمیت کا تصور تھا۔ اب سے سوا سو برس پہلے ریل، دخانی جہاز، چھاپے خانے اور مغربی تمدن و طرز حکومت کے کئی ادارے اپنے وجود کی پرچھائیاں ہماری خارجی اور داخلی زندگی پر ڈالنے لگے۔ تہذیب و تمدن کا ایک پورا دور ہم سے الوداع کہہ رہا تھا اور ایک دوسرا دور ہم سے اپنا استقبال اور خیر مقدم کرا رہا تھا۔ اب مغربی علوم بھی ہماری ذہنی زندگی اور ہمارے شعور میں داخل ہونے لگے اور ہماری قومی نفسیات کا جزو بننے لگے۔ عظیم مفکر مارکس نے ۱۸۵۳ء میں یہ پیش گوئی کی تھی کہ انگریز ہندوستان میں تاریخ کے غیر شعوری اور غیر ارادی آلۂ کار ہیں۔ المختصر اب سے ڈیڑھ سو برس پہلے نمایاں طور پر ہندوستان ایک نیا ہندوستان بننا شروع ہو گیا تھا اور یہ ردو بدل یا انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد سے نمایاں سے نمایاں تر ہونے لگا۔

میں تو ابھی پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔ اس وقت میرے دادا کی جوانی تھی اور میرے والد منشی گورکھ پرشاد عبرت بھی ابھی ۱۸۵۷ء میں پیدا نہیں ہوئے تھے بلکہ

اس کے دو برس بعد پیدا ہوئے۔ سیلاب مغربیت کے پہلے ریلے میں والد مرحوم کا بچپن اور ان کی جوانی نشو ونما کی منزلوں سے گزری۔ اب ہندوستان کی تمام زبانوں اور ان کے ادب پر ایک نئے ادب اور مختلف ادب اور اس کے نظریوں اور مقاصد کی اثر اندازی شروع ہو کر بڑھنے لگی تھی۔ جس دور سے آزاد، حالی، نذیر احمد اور شبلی کا تعلق تھا اس دور کی دوسری دہائی میں میرے والد کی شاعری نے آنکھیں کھولیں۔ انھوں نے بہت حسین زاویے اور بہت لطیف انداز سے اپنی اردو نظموں اور غزلوں میں انگریزی ادب کا اثر لیا اور اس کا تتبع کیا۔

میری شاعری ابتداء میں اردو کی روائتی غزل گوئی کی پسندیدہ مثالوں سے متاثر رہی۔ یہاں ایک قابل ذکر نکتہ یہ ہے کہ انگریزی تہذیب و ادب کا ایک اثر اردو ادب پر اس انداز سے پڑنے لگا تھا کہ اردو شاعری کے ابتدائی ادوار سے بیسویں صدی کی دوسری اور تیسری دہائی تک کے اردو ادب کا جو حصّہ اصلیت سے مملو تھا اور جس پر دور ناسخ کے بعد سے ایک پردہ پڑ گیا تھا، اس حصّے کی از سر نو نشاۃ الثانیہ ہونے لگی تھی۔ میرے والد جہاں گھریلو صحبتوں میں حالی اور آزاد کا ذکر کیا کرتے تھے وہاں غالب، نظیر اکبر آبادی اور انیس کی عظیم ادبی خدمات کو بھی سراہتے تھے۔ میں خود عنفوان شباب میں شدید جنسی جذبات اور جنسی ناکامیوں کی مسلسل تڑپ اور اضطراب کا شکار رہا اور یہ کیفیت کوئی ایسی چیز نہ تھی جو آئی گئی ہو کر رہ جائے۔ کم وبیش چالیس برس تک مجھے یہ کرب انگیز کیفیت اپنی گرفت میں لیئے ہوئے تھی۔ خیریت گزری کہ میں نے جنسیت کی ہائے وائے تک اپنی خارجی و داخلی زندگی کو محدود نہیں رکھا۔ دنیائے علوم، ہندوستانی اور عالمی کلچر اور دنیائے انسانیت اور ساتھ ہی آفاقی ادب کی کشش اور ان کے مطالبات و مقاصد بھی مجھ پر مسلط رہے۔ مفلوج و مجہول ہو کر بھی میں نے اپنے کو مفلوج و مجہول نہ ہونے دیا۔ اپنے زخمی اور نیم شکستہ بال و پر کے باوجود اپنا ذوق

پرداز جہاں تک ہو سکا میں نے محفوظ رکھا۔

ہاں! تو میری شاعری کا کم و بیش تین چوتھائی حصہ عشقیہ شاعری یا عشقیہ غزل گوئی کے لئے وقف رہا اور اس عشقیہ شاعری کو میں نے آفاقی کلچر اور ہندوستانی کلچر کی بلند ترین روایتوں سے مہذب بنانے کی کوشش عمر بھر یا نصف صدی تک جاری رکھی۔ میری غزلوں میں خارجی طور سے یا براہ راست ادھار یا مستعار لینے کے انداز سے انگریزی شاعری کا اثر نہ ملے گا۔ لیکن انگریزی شاعری کا گمبھیر شعور اور لب و لہجہ یا طرز احساس ایک جاری و ساری اور تحلیل شدہ عنصر یا اثر کی شکل میں ملے گا۔ میرے شعور کی مخصوص آواز اور اس کے لب و لہجہ کی تخلیق میں اور اس کے نشو و نما میں جہاں قدیم ہندوستان کے بلند ادب کا طرزِ تفکر کارفرما رہا ہے وہاں بہترین اردو اور فارسی شاعری کی فضا اور اس شاعری کی اقدار کے ساتھ ساتھ انگریزی ادب کا انداز تفکر بھی ملی جلی شکل میں کام کرتے رہے ہیں۔ سب سہی! لیکن میں نے اپنی غزل گوئی میں ایسی بات پیدا نہیں ہونے دی کہ اردو غزل گوئی کی بہترین اور لطیف ترین روایات سے اجنبیت یا غیریت یا ناہم آہنگی کا احساس میرے ان اشعار میں نظر آئے جن میں اور عناصر و اثرات کے ساتھ ساتھ انگریزی شاعری کے عناصر و اثرات بھی تعمیری و تخلیقی حیثیت سے شامل ہوں۔ شاعری ایک "کارگہِ شیشہ گراں" ہے جہاں "لے سانس بھی آہستہ" کا قانون جاری ہے۔ اردو شاعری کے علاوہ کسی بھی شاعری یا تہذیب کے اثرات کو اپنی غزل گوئی میں سمیٹتے وقت مجھے اس احتیاط سے کام لینا پڑا ہے کہ اردو غزل کی روائتوں کو ٹھیس نہ لگ جائے۔ نئے پن کو پرانے پن سے ہم آہنگ کئے بغیر تخلیقی جدت کامیاب نہیں ہوتی۔ اسی اصول کو میں نے برابر پیش نظر رکھا ہے۔ ایک نکتہ اور بھی بہت اہم اور قابل توجہ ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہر زبان اور ہر قوم بلکہ ہر دور کے شعر و ادب کا ایک حصہ آفاقی اور عالمگیر ہوا کرتا ہے۔ اور یہ حصہ مقامی و مخصوص نہیں ہوا کرتا بلکہ انسانیت

کی وحدت کا پتہ دیتا ہے۔ چنانچہ اردو ادب میں بھی صد ہا اشعار ایسے مل جاتے ہیں جنھیں محض مشرقی شاعری کہہ کے ٹالا نہیں جا سکتا بلکہ جنھیں آفاقی شاعری کہنا پڑتا ہے۔ اردو شاعری کے ایسے اشعار سنسکرت شاعری، یونانی شاعری، لاطینی شاعری اور مغرب کی موجودہ زبانوں کی شاعری، منجملہ جن کے انگریزی شاعری بھی ہے، کی نشان دہی کرتے ہیں۔ میری زندگی اور میری شاعری کے ارتقا میں وہ دور آگیا تھا کہ اردو ادب کے عالمگیر اشعار کی آفاقیت کو پہچان لوں۔ ایسے اشعار سے شعوری یا تحت الشعوری طور پر متاثر ہو کر مجھ سے ایسے متعدد اشعار ہوتے رہے جو انگریزی ادب کے آفاقی اشعار کی دھڑکنیں اپنے اندر رکھتے تھے۔ آفاقی ادب کی صد ہا اقدارِ مشترک کو اپنی شاعری میں سمونا اور ساتھ ساتھ اپنی شاعری کے خد و خال کو مسخ ہونے یا بگڑنے سے بچا لینا ہر ذمہ دار شاعر کا فرض ہے۔ دنیا ایک عالمی انسانی مشترکہ تہذیب و ادب کی طرف گامزن ہے۔ اردو شاعری بھی گزشتہ کم و بیش نصف صدی سے مقامیت یا محض مشرقیت کی جکڑبندیوں سے آزاد ہو رہی ہے۔

انگریزی شاعری کا ایک نہایت رچا ہوا مذاق فطرت پرستی (Nature worship) یا مناظر قدرت سے والہانہ عشق رہا ہے۔ اردو ادب میں ہم کو آپ کو نیچریہ شاعری تو ملتی ہے لیکن یہ شاعری رسمیت یا محض مصوری سے آگے نہیں بڑھتی۔ نیچر کی رمزیت، انسانی زندگی اور خواب زندگی سے مناظر قدرت یا مادی کائنات کی ہم آہنگی یا زندہ رشتے کی مثالیں مجھ سے پہلے اردو شاعری میں بہت کم ملتی تھیں۔ انسانیت کا محض انسانیت ہو کر رہ جانا اسے انسانیت سے بھی محروم کر دیتا ہے۔ زمین، دریا، سمندر، پہاڑ، جنگل، وادیاں، موسموں کا جلوس، فلکیات اور قدرت کے مظاہر، جانوروں کی زندگی، یہ سب ایسے حقائق ہیں جن سے انسان کو ہم آہنگ ہونا ہے۔ اور جن کے لئے پرستارانہ جذبات و احساسات کو اپنے شعور

میں پرورش دینا تہذیب کا ایک اہم مسئلہ ہے۔ میں نے اپنی غزلوں میں چوتھائی صدی سے اکثر ایسے اشعار کہے ہیں جن میں انسان کی عشقیہ اور غیر عشقیہ زندگی یا عام زندگی کی فطرت سے ہم آہنگی کی طرف رنگا رنگ اشارے ہیں۔ اب میں کچھ زیادہ نہ کہہ کر اپنی غزلوں کے چند اشعار پیش کئے دیتا ہوں جو روا روی میں اس مضمون کے دوران تحریر میں مجھے یاد آتے رہے ہیں:۔

کسی کی بزم طرب میں حیات بٹتی تھی　　امیدواروں میں کل موت بھی نظر آئی
کہاں ہر ایک سے بارِ نشاط اٹھتا ہے　　کہ یہ بلا بھی ترے عاشقوں کے سر آئی

خلوتِ راز میں فقط ہم تم　　ایک کمرے کو کائنات کریں

"And make one little room and everywhere"

—John Donne

فضا تبسم صبحِ بہار تھی لیکن　　پہنچ کے منزلِ جاناں پہ آنکھ بھر آئی

موت اک گیت رات گاتی تھی　　زندگی جھوم جھوم جاتی تھی
زندگی کو وفا کی راہوں میں　　موت خود روشنی دکھاتی تھی

ہر عقدۂ تقدیرِ بشر کھول رہی ہے　　ہاں دھیان سے سننا یہ صدی بول رہی ہے
چھڑتے ہی غزل بڑھتے چلے رات کے سائے　　آواز مری گیسوئے شب کھول رہی ہے

کچھ قفس کی تیلیوں سے چھن رہا ہے نور سا
کچھ فضا کچھ حسرتِ پرواز کی باتیں کرو

شام بھی تھی دھواں دھواں حسن بھی تھا اداس اداس
دل کو کئی کہانیاں یاد سی آکے رہ گئیں

یہ کھیتوں کی نرم روی یہ ہوا یہ رُت   یاد آرہے ہیں عشق کو ٹوٹے تعلقات

دیکھ جب عالم یہ ہے حسن خمار آلود کا   صبح کو لیتی ہو جیسے کائنات انگڑائیاں

زلفوں کے خنک سائے میں سکوں پا جاتی ہے میری طبع رواں
یوں جیسے نیم شبی گنگا کروٹ لے کر سو جاتی ہے

کیف بردوش بادلوں کو نہ دیکھ   بے خبر تو کچل نہ جائے کہیں

ہری بھری رگوں میں وہ چہکتا بولتا لہو   وہ سوچتا ہوا بدن خود اک جہاں لئے ہوئے

"Her pure and eloquent blood spoke in her cheeks, and so distinctly wrought that one might almost say, her body thought."

—John Donne

دکھاتے ہیں ستارے ایک بہتر زندگی کا خواب
نہ دیکھ انکی طرف وہ چھین لیں گے سب خوشی تیری

کبھی پچھلی رات کو دیکھ لے کسی سانس لیتے چراغ کو
کہ غزل ہوئی تو شعور میں وہی خستگی ہے وہی تھکن

مری ہر غزل کو یہ آرزو تجھے سج سجا کے نکالیے
مری فکر ہو ترا آئینہ مرے نغمے ہوں ترے پیرہن

کبھی ہو سکا تو بتاؤں گا تجھے راز عالم خیر و شر
کہ میں رہ چکا ہوں ازل ہی سے گہے ایزد و گہے اہرمن

جسے ڈس لیا ہو زمانے نے کوئی زندگی ہے وہ زندگی
یہ سواد شام اجل نما یہ ضیائے صبح کفن کفن

یہ اداس اداس بجھی بجھی کوئی زندگی ہے فراق کی
مگر آج کشت سخنوری ہے اسی کے دم سے چمن چمن

اس دور میں زندگی بشر کی — بیمار کی رات ہو گئی ہے
جس شے پہ نظر پڑی ہے تیری — تصویر حیات ہو گئی ہے

وہ تیری نرم دوشیزہ نگاہیں دل نہیں بھولا
پڑی جب جب نظر تیری نگاہ اولیں نکلی

اب دور آسماں ہے نہ دور حیات ہے — اے درد ہجر تو ہی بتا کتنی رات ہے

کون یہ لے رہا ہے انگڑائی — آسمانوں کو نیند آتی ہے

حسن اک خواب ناز ہے جس کے — چونک پڑنے کو عشق کہتے ہیں

شام کے سائے کھلے ہوں جس طرح آوازیں — ٹھنڈکیں جیسے کھنکتی ہوں گلے کے ساز میں

اٹھ گیا عشق آج دنیا سے
پرچم حسن اک ذرا خم ہے

حسن کی نرمیوں نے لو دے دی
مسکرانا ترا ہے یاد مجھے

جب جب اسے سوچا ہے دل تھام لیا میں نے
انسان کے ہاتھوں سے انسان پہ جو گزری

وہ عالم ہوتا ہے مجھ پر جب فکرِ غزل میں کرتا ہوں
خود اپنے خیالوں کو ہمدم میں ہاتھ لگاتے ڈرتا ہوں
جب سازِ غزل کو چھوتا ہوں راتیں لو دینے لگتی ہیں
ظلمات کے سینے میں ہمدم میں روز چراغاں کرتا ہوں

ترا وصال بڑی چیز ہے مگر اے دوست
وصال کو مری دنیائے آرزو نہ بنا

خستگی مہر و ماہ کی مت پوچھ
کون پیمانہ ہے جو چور نہیں

کیا کریں ہم بھی کیا کرو تم بھی
آدمی آدمی کا دشمن ہے

یہ نرم نرم ہوا جھلملا رہے ہیں یہ چراغ
ترے خیال کی خوشبو سے بس رہے ہیں دماغ
جو چھپ کے تاروں کی آنکھوں سے پاؤں دھرتا ہے
اسی کے نقشِ کفِ پا سے جل اٹھے ہیں چراغ
دلوں میں داغِ محبت کا اب یہ عالم ہے
کہ جیسے نیند میں ڈوبے ہوں پچھلی رات چراغ

پوچھ مت کیفیت قلب دمِ فکرِ سخن — میں نے دیکھی ہیں خیالوں کی بھی آنکھیں پرنم

یہ دکھ یہ رنج یہ آزردہ حالیاں تیری — جو چوم چوم نہ لوں سب اداسیاں تیری

پوچھ مت کیفیتیں ان کی نہ پوچھ ان کا شمار
چلتی پھرتی ہیں مرے سینے میں جو پرچھائیاں

کہاں کا وصل تنہائی نے شاید بھیس بدلا ہے
ترے دم بھر کے آجانے کو ہم بھی کیا سمجھتے ہیں

حسن کو اک حسن ہی سمجھے نہیں اور اے فراقؔ
مہرباں نامہرباں کیا کیا سمجھ بیٹھے تھے ہم

دیکھ آئے آج یادوں کا نگر — ہر طرف پرچھائیاں پرچھائیاں

زندگی کیا ہے آج اسے اے دوست — سوچ لیں اور اداس ہو جائیں

"Where but to think is to be full of sorrow" —Keats

بہت آہستہ اٹھتی ہے نگاہِ شاعرِ فطرت — رخِ ہستی سے چادر سی مگر سرکا ہی جاتی ہے

جو مہکی چھاؤں میں نغموں کی پنکھڑی سے بنے — وہی سنا ہے ترے حسن کا نشیمن ہے

فراق رات گئے یہ نوائے نیم شبی — جو کائنات کے اشکوں میں ہے نہائی ہوئی

یہ زندگی کے کڑے کوس یاد آتا ہے　　تری نگاہِ کرم کا گھنا گھنا سایہ

مہربانی کو محبت نہیں کہتے اے دوست
آہ اب مجھ سے تری رنجشِ بے جا بھی نہیں

"Love is not amity"-Francis Thomson

کس کے پاؤں کی چاپ ہے دنیا　　کون ہے صبحِ ازل سے خراماں

چاند اک گیت رات گاتا تھا　　گنگناتا ہو جیسے اک مردہ

رگیں زمیں کے مناظر کی پڑ چلیں ڈھیلی
وہیں فلک کے چراغوں کی جھلملائی ہوئی

ہنوز وقت کے سینے میں جگمگاہٹ ہے
دمکتے روپ کی دیپاولی جلائی ہوئی

ہنوز وقت کے کانوں میں چھم چھماہٹ ہے
وہ چاپ تیرے قدم کی سنی سنائی ہوئی

وہ خواب گاہ میں شعلوں کی کروٹیں دمِ صبح
وہ بھیرویں تری بیداریوں کی گائی ہوئی

حیاتِ عشق ندیم آخری زمانے میں　　دلا گئی کسی مٹتے ہوئے نظام کی یاد

زمین جاگ رہی ہے کہ انقلاب ہے کل　　وہ رات ہے کوئی ذرّہ بھی محوِ خواب نہیں
خراب حال بھی اچھی طرح خراب نہیں　　یہ ہے عذابِ جہنّم کہ وہ عذاب نہیں

"Hell is uncertainty" Bernard Shaw

حاصلِ حسن و عشق بس اتنا　　آدمی کو پہچانے

بہار غنچہ بہ غنچہ چمن میں آتی ہے　　قدم قدم پہ چھلکتا ہے رنگِ فتنہ گری

"And Blossom by blossom the spring
arrives."......................Swinburne

تھی زندگی میں کبھی صبحِ نو کی تازہ دمی　　شعور پر نہ رسوم و قیود کا تھا خمار

"And custome lie on thee
Heavy as frost and deep almost as life."

—Wordsworth

اس طرح کے اتنے اشعار میری غزلوں میں مل جائیں گے جن سے ایک مختصر دیوان مرتب ہو سکتا ہے یا جن کی تعداد ایک ہزار اشعار سے بھی زیادہ تک پہنچے گی۔ کچھ آگے کہنے سے پہلے یہ عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میری تمام کی تمام غزلوں، رباعیوں اور نظموں پر محض انگریزی یا مغربی شاعری کا اثر یا اس کی پرچھائیاں نہیں ہیں۔ فارسی اور اردو شاعری کی بہترین روائتوں پر میں نے اپنی شاعری کی عمارت تعمیر کی ہے۔ جدت یا اجتہاد کو زندہ اور مسلسل روایت سے میں نے ہم آغوش و ہم آہنگ رکھا ہے۔ منقولہ بالا اشعار میں دو چار کو چھوڑ کر بقیہ تمام اشعار میں نے اپنی غزلوں ہی سے منتخب کئے ہیں۔ یہ بات بھی نہیں کہ انگریزی شاعری کے طرزِ احساس و طرزِ بیان کا جو پرتو میرے ان اشعار اور ایسے ہی صدہا اشعار پر پڑ رہا ہے اس کا اندازہ یا اس کی پرکھ صرف انگریزی داں حضرات کو ہو۔ نہایت محبت و خلوص و احترام کے ساتھ اردو کے بہت سے نوجوان ہم عصروں نے مجھ سے کہا ہے کہ ہم لوگ یہ باتیں کہاں سے لائیں۔ ان کے لئے تو انگریزی شاعری سے استفادہ کرنا لازمی ہے۔ ایک بات اور اس دورانِ گفتگو میں عرض کر دوں۔ وہ یہ ہے کہ اردو، فارسی اور عربی شاعری میں ایک چیز کی کمی رہی اور وہ چیز ہے فضا آفرینی جس کی بہترین

مثالیں سنسکرت شاعری، یونانی شاعری اور انگریزی شاعری میں مختلف انداز اور مختلف صورتوں میں ملتی ہیں۔ میرے یہاں ایسے اشعار کی تعداد بہت بڑی ہے جن میں یہ فضاآفرینی اپنی جھلک دکھا رہی ہے۔ دوسری صفت جسے ہم کئی لحاظ سے روح شاعری کہہ سکتے ہیں اور جو فارسی، اردو اور عربی شاعری میں بہت کم نظر آتی ہے وہ صفت ہے جسے ہم خوابناکی کہہ سکتے ہیں اور جو ہمیں انسانیت کے اس دورِ اوّلیں کی طرف لے جاتی ہے جب جادوگری کی آغوش میں یا منتر جگانے کے عمل میں قدیم ترین شاعری نے جنم لیا۔ آج ہم جسے کیفیت کہتے ہیں اور جس کی کمی اردو شاعری میں نہیں ہے وہ اس خوابناکی کی ذرا اتری ہوئی منزل ہے۔ انگریزی شاعر ورڈزورتھ کہتا ہے:۔

"The light that never was on land or sea.

The Consecration and the poet's dream."

انگریزی شاعری سے جہاں میں نے بہت کچھ حاصل کیا وہاں خوابناکی کے لچھن بھی اپنی شاعری میں متعدد مقامات پر پیدا کرنے کی کوشش کی۔ مغربی ادب اور انگریزی شاعری کا اثر میری شاعری پر یوں نہیں پڑا کہ صدہا یا ہزارہا انگریزی نثر و نظم کے جملے یا مصرعے یا اشعار کا میں نے اردو میں ترجمہ کر دیا ہو۔ اگرچہ میری پوری شاعری میں کچھ انگریزی کی نظموں اور اشعار کا ترجمہ بھی مل جائے گا لیکن جیسا کہ عرض کر چکا ہوں ایک فضا یا آب وہوا یا مخصوص طرزِ احساس و طرزِ بیان کی شکل میں انگریزی شاعری کا اثر میری شاعری میں ملے گا۔ یہ فضا بسااوقات میرے انفرادی جمالیاتی احساس اور ہندو روائتوں اور آدرشوں سے پیداشدہ فضا یا خود فارسی و اردو روایات کی فضا سے اس طرح مل جل گئی ہے جیسے کسی آلہ میں مختلف الرنگ شعاعی (Spectrum) کا منظر دکھائی دیتا ہے۔ یہ آلہ میری آواز ہے جس میں رنگارنگ گونجیں یا بازگشت آوازیں بسااوقات تھرتھراتی اور جھلملاتی ہوئی نظر آئیں گی۔ ہم چاہیں تو اس مشترکہ اثر سے پیداشدہ رنگ شاعری کو ایک قوسِ قزح سے بھی تشبیہہ دے سکتے ہیں جسمیں

کے اردو ترجمہ سے ہوا تھا۔ لیکن جب یہ نظم آگے بڑھی تو تصوف کے وہ حقائق جو مذکورہ بالا انگریزی کتاب سے میرے اندر پیدا ہوئے تھے اس نظم میں جلوہ گر ہونے لگے۔ تصوف کا موضوع ماضی و حال اور مشرق و مغرب کے ادب و ثقافت کو ایک مرکز پرلے آتا ہے اس لئے میری یہ نظم تمام اردو حلقوں میں بہت مقبول ہوئی۔ زندگی کے رنگا رنگ پہلوؤں کے متضاد و متصادم اجزا کی وحدت کو اس نظم میں پیش کیا گیا ہے۔

اب سے بیس برس پہلے میں نے روپ کی رباعیاں کہنا شروع کیا تھا۔ پہلی ہی رباعی میں جو مصرعہ بہت مشہور و مقبول ہوا یعنی۔

سنگیت کی سرحدوں کو چھو لیتا ہوں

وہ لفظ بہ لفظ ترجمہ ہے ہلیر بلک کے اس فقرے کا

"I Touch the boundaries of music"

روپ ہی کی ایک رُباعی کے دو مصرے یوں ہیں

جب تاروں نے جگمگاتے نیزے توے
جب شبنم نے فلک سے موتی روے

یہ مصرے پر تو ہیں انگریزی شاعر بلیک کے مندرجہ ذیل مصرعوں کے :۔

"When the stars threw down their spears
And watered heaven with their tears"

ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے ایک بہت گہری بات کہی ہے کہ ہر شاعر میں بربریت کے زمانے سے آج تک تہذیب میں انسانیت کے جتنے ادوار گزرے ہیں سب مرکوز ہو جاتے ہیں۔ اب یہ رباعی دیکھئے :۔

لَے میں مری گونجتا ہے سورج منڈل — میرے سوز دروں میں مل کر ہوئی حل
دنیا میں جب آدمی نے آنکھیں کھولیں — اسوقت سے آج تک کی تاریخ ازل

ایڈورڈ کاربینٹر نے لکھا ہے کہ ہر سچے عاشق کو یہ حق پہونچتا ہے کہ اپنے آپ کو وہ ایک دیوتا سمجھے۔ اس خیال کا پرتو مندرجہ ذیل رباعی میں نظر آئے گا۔

پیغمبرِ عشق ہوں سمجھ میرا مقام
صدیوں میں پھر سنائی دے گا یہ کلام
وہ دیکھ کہ آفتاب سجدے میں گرے
وہ دیکھ اُٹھے دیوتا بھی کرنے کو سلام

انگریزی شاعر واٰن (Vaughan) کا مشہور مصرعہ ہے:۔

"I Saw Eternity like a ring of light"

جس کا ترجمہ میری اس رباعی میں ہو گیا ہے:۔

اک حلقۂ نور تھا ابد کا منظر
آویزاں بے شمار خورشید و قمر
تا حدِ نظر سلسلۂ موجودات
ہر شے سے ابھر رہی تھی تقدیرِ بشر

آخری مصرعے میں جس خیال کا اظہار کیا گیا ہے وہ کسی نظم سے مستعار نہیں ہے۔

ایک ادب پر دوسرے ادب کا اثر ضروری نہیں ہے کہ غلامانہ تقلید یا ترجمہ کی ہی شکل میں رونما ہو۔ جب ایک ہی ادب کے کسی عظیم فن کار کا اثر دوسرے عظیم فن کار کے کلام پر مستقل طور پر پڑتا ہے تو دونوں کے لب و لہجے کی یکسانیت اور اندازِ احساس کی مماثلت آسانی سے پہچانی جاسکتی ہے۔ جیسے انیسؔ کا رنگ چکبستؔ کے مسدس میں جھلکتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس طرح ایک دورِ شاعری یا دبستانِ شاعری کے مختلف شاعروں کے کلام میں ہم آہنگی و یکسانیت سنائی اور دکھائی دے جاتی ہے۔ میری شاعری میں مصحفیؔ کا رنگ، مومنؔ کا رنگ، آتشؔ کا رنگ بسا اوقات نظر آئیگا۔ لیکن میری غزلوں کے ایک معتدبہ حصے پر جس طرح میرؔ کا رنگ تہ در تہ اور آئینہ

در آئینہ نظر آجائے گا۔ وہ میر کے ہم عصروں سے لے کر آج تک کے کسی دوسرے شاعر کے یہاں نظر نہ آئے گا کیونکہ میر کے احساس، میر کا وجدان اور میر کی آواز میرے خون میں حل ہو کر رہ گئے ہیں۔ انگریزی شاعری کا اثر اردو شاعری پر مختلف سطحوں سے پڑا ہے اور یہ اثر جتنا ہی کامیاب ہوگا اسی قدر بتانا مشکل ہو جائے گا کہ اس کا سرچشمہ کیا ہے۔ چند باتوں سے اس اثر کی نشان دہی ہوتی ہے۔ معمولی نشان دہی تو موضوعات کے انتخاب سے ہوتی ہے۔ اس سے زیادہ اہم ہے الفاظ اور فقروں کی ساخت، تشبیہوں اور استعاروں اور تعبیروں کی وہ کائنات بھی اس اثر کی نشان دہی کرتی ہے جس کائنات سے انگریزی شاعری کی کائنات ملتی جلتی نظر آتی ہے۔ انگریزی ادب کا مطالعہ میں نے نہایت پر خلوص اور حساس طریقے سے کیا ہے اور انگریزی شاعری کے جواہر پارے مجھ میں ایک سپردگی اور مکمل ہم آہنگی کا عالم پیدا کرتے رہے ہیں۔ یہ سپردگی و ہم آہنگی جتنی گہری اور جتنی مکمل ہوگی اتنا ہی انگریزی شاعری کا اثر میری شاعری پر بھرپور نظر آئے گا اور یہاں تک محسوس ہونے لگے گا گویا انگریزی شاعری کی روح نے اردو شاعری کا چولا دھار لیا ہے۔ انگریزی شاعری کا حقیقی و مرکزی لب و لہجہ اس بحر (metre) میں نظر آتا ہے جسے (Imbic-Pentametre) کہتے ہیں اور جس کے دس ارکان (Syllables) ہوتے ہیں۔ یہ بحر مقفیٰ اور غیر مقفیٰ دونوں طریقوں سے انگریزی شاعری میں کثرت سے استعمال کی گئی ہے۔ پہلے مقفیٰ طور پر اصل انگریزی میں اس کی ایک مثال دیکھیں۔

"The One remains the many change and pass
Heaven's light for ever shines, earth's shadows fly,
Life like a dome of many-coloured glass
Stains the white radiance of eternity"

—Shelley

غیر مقفیٰ صورت یعنی بلینک ورس کی صورت میں اس بحر کی ایک مثال دیکھئے:

There drew he forth the Excalibur,
And o'er him drawing it, the winter moon.
Brightening the skirts of long cloud ran forth.
And sparkled keen with frost against the hilt
For all the haft twinkled with diamond sparks,
Myriads of topaz lights and Jacinth work
of subtlest jewellry.

شیکسپیر کے تمام المیوں اور ملٹن کی فردوس گم شدہ یا بازیافت فردوس اور انگریزی شاعری کے اہم ترین کارناموں کی سترنی صدی بحریں، یہی بحر ہے۔ میرے وجدان میں یہ بحر قریب قریب الآہنگ محسوس ہوئی اس کی مثال میرا ہی یہ شعر ہے:۔

نہ ذکرِ موجِ فنا کر کہ غم کے بیڑوں کو
گداز سینۂ ساحل ڈبو چکا کب سے

معریٰ یا غیر مقفیٰ شکل میں، میں ایک مدت تک اس فکر میں تھا کہ اردو میں کوئی ایسی نظم کہوں جو صوتیات کے لحاظ سے انگریزی بلینک ورس کی اس بحر سے ہم آہنگ ہو۔ برسوں کی خاموش کاوش کے بعد میری وہ نظم رونما ہوتی ہے جس کا عنوان ہے "آدھی رات"، اگرچہ یہ نظم نیم ارادی طور پر کہیں کہیں مقفیٰ ہوگئی ہے۔ اس کے دو اقتباسات پیش کرتا ہوں:۔

سیاہ پیڑ ہیں اب آپ اپنی پرچھائیں
زمین سے تا مہ و انجم سکوت کے مینار
جدھر نگاہ کریں اک اتھاہ گم شدگی
اک ایک کر کے فسردہ چراغوں کی پلکیں

جھپک گئیں جو کھلی ہیں جھپکنے والی ہیں
جھلک رہا ہے پڑا چاندنی کے درپن میں
رسیلے کیف بھرے منظروں کا جاگتا خواب
فلک پہ تاروں کو پہلی جماہیاں آئیں

گلوں نے چادرِ شبنم میں منہ لپیٹ لیا
لبوں پہ سو گئی کلیوں کی مسکراہٹ بھی
ذرا بھی سنبل تر کی لٹیں نہیں ہلتیں
سکوتِ نیم شبی کی حدیں نہیں ملتیں
اب انقلاب میں شاید زیادہ دیر نہیں
گزر رہے ہیں کئی کارواں دھندلکے میں
سکوتِ نیم شبی ہے انھیں کے پاؤں کی چاپ
کچھ اور جاگ اٹھا آدھی رات کا جادو

دوسری نظم کا عنوان "پرچھائیاں" ہے جس کے صرف دو اقتباسات پیش کر رہا ہوں۔ پہلے یہ نظم "دھندلکا" کے نام سے شائع ہوئی تھی۔

یہ شام اک آئینۂ نیلگوں، یہ نم، یہ مہک
یہ منظروں کی جھلک، کھیت، باغ، دریا، گاؤں
وہ کچھ سلگتے ہوئے کچھ سلگنے والے الاؤ
سیاہیوں کا دبے پاؤں آسمان سے نزول
لٹوں کو کھول دے جس طرح شام کی دیوی
پرانے وقت کے برگد کی یہ اداس جٹائیں

قریب و دور یہ گودھول کی ابھرتی گھٹائیں[1]
یہ کائنات کا ٹھہراؤ، یہ اتھاہ سکوت
یہ نیم تیرہ فضا روز گرم کا تابوت
دھواں دھواں سی زمین ہے گھلا گھلا سا فلک

کسی خیال میں ہے غرق چاندنی کی چمک
ہوائیں نیند کے کھیتوں سے جیسے آتی ہوں[2]
حیات و موت میں سرگوشیاں سی ہوتی ہیں
کروروں سال کے جاگے ستارے نم دیدہ
سیاہ گیسوؤں کے سانپ نیم خوابیدہ
یہ پچھلی رات، یہ رگ رگ میں نرم نرم کسک

جن دو نظموں کے اقتباسات آپ نے دیکھے وہ ہماری دنیائے شاعری میں بہت مقبول ہوئیں۔ ان نظموں کی تخلیق کا زمانہ ۴۵-۱۹۴۴ء ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب اردو شاعری میں غیر مقفّیٰ نظم رونما ہو رہی تھی۔ مجھے یہ جان کر غیر معمولی اطمینان ہوا کہ بلند ترین تنقیدی حلقوں میں ان نظموں کو اردو کی غیر مقفّیٰ شاعری کا بلند ترین نمونہ قرار دیا گیا اور یہ کہا گیا کہ جہاں تک یہ نظمیں پہونچی ہیں یا جن مقامات کو ان نظموں نے مس کیا ہے وہاں تک اردو شاعری آج تک پہونچ نہیں سکی تھی۔ پطرس مرحوم نے مجھے یہ نظمیں ریڈیو سے نشر کرتے سنا تھا اور والہانہ انداز میں

---

[1] گودھول۔ چراگاہوں سے پلٹتے ہوئے مویشی کی چالوں سے اڑتی ہوئی گرد۔

[2] "The winds seem to come from fields of sleep." ………………Words Worth

ان کی داد دی تھی۔ جگر مرحوم نے ٹھیٹھ غزل گو شاعر ہوتے ہوئے ان نظموں میں بظاہر غیر متوقع انداز میں بالکل اچانک طور پر بادی النظر میں بے تعلق باتوں اور مصرعوں کے متعلق یہ کہا تھا کہ ان نظموں کی یہی خصوصیت جانِ نظم ہے۔ علی سردار جعفری نے بھی ان نظموں کا غیر معمولی اثر لیا تھا۔ اب اسے کیا کروں کہ لوگ اس امر کے درپے ہیں کہ فراقؔ صرف شاعرِ غزل ہے۔

مضمون کسی قدر طویل ہوگیا ہے اس لئے بہت سی مثالیں اور بہت سے نکات چھوڑ کر صرف ایک اور نظم سے چند ٹکڑے پیش کروں گا۔ یہ اقتباسات اپنی نظم "جگنو" سے پیش کرتا ہوں۔

یہ مست مست گھٹا یہ بھری بھری برسات
تمام — حدِ نظر تک — گھلاوٹوں کا سماں
فضائے شام میں ڈورے سے پڑتے جاتے ہیں
جدھر نگاہ کریں کچھ دھواں سا اٹھتا ہے
دہک اٹھا ہے طراوت کی آنچ سے آکاش
ز فرش تا فلک انگڑائیوں کا عالم ہے
یہ مد بھری ہوئی پروائیاں سنکتی ہوئی
جھنجھوڑتی ہے ہری ڈالیوں کو سرد ہوا
یہ شاخسار کے جھولوں میں پینگ پڑتے ہوئے
یہ لاکھوں پتیوں کا ناچنا یہ رقصِ نبات
یہ بے خودیٔ مسرت یہ والہانہ رقص
یہ تال سم یہ چھما چھم — کہ کان بجتے ہیں
ہوا کے دوش پہ کچھ اودی اودی شکلو نگی
نشے میں چور سی پرچھائیاں تھرکتی ہوئی

افق پہ ڈوبتے دن کی جھپکتی ہیں آنکھیں
خموش سوزِ دروں سے سلگ رہی ہے یہ شام

یہ نظم برسوں کی خاموش کاوش کا نتیجہ ہے۔ فارسی اور اردو شاعری میں مجھے "مادی ٹھوس پن" کی کمی کھٹکتی رہی ہے۔ میرے ہندو سنسکاروں کا یہ تقاضا رہا ہے کہ جس طرح فنِ تعمیر میں اور زندگی کے صدہا جزدیات میں مادی وزن اور ٹھوس پن یا بھرپور پن کو ایک خاص اہمیت حاصل رہی ہے اور لمیاتی احساس کو نمایاں حیثیت حاصل رہی ہے اسی طرح اردو شاعری کو بھی اس دولت سے مالا مال ہونا چاہیئے۔ یعنی شاعری کو بت گری کا حریف بنا دینا چاہیئے۔ یہ خصوصیت صرف ہندو کلچر کی نہیں رہی ہے بلکہ تمام آریائی تہذیب کی خصوصیت رہی ہے جس میں قدیم ایرانی تہذیب بھی شامل ہے۔ اسی سے تو فردوسی کے شاہنامے میں وہ ٹھوس اور بھرپور مصوری یا بت گری ہمیں اکثر مل جاتی ہے جس کا ذکر میں کر رہا ہوں۔ کہیں کہیں میر انیس بھی فردوسی کے فیضان سے مستفید ہو کر مادیت کا جادو دکھاگئے ہیں۔ یہ صفت سب سے نمایاں شکل اختیار کرتی ہے مناظرِ فطرت کی مصوری میں، جس سے انگریزی ادب معمور ہے۔ فطرت بڑی ٹھوس اور بھرپور چیز ہے۔ دوسری کمی فارسی اور اردو شاعری میں عموماً یہ رہی ہے کہ فطرت کی مصوری میں چابک دستی سے زیادہ کام لیا گیا ہے اور محویت یا ٹھہراؤ سے بہت کم کام لیا گیا ہے۔ ہماری نیچریہ شاعری کو مادے میں ڈوبنا نہیں آیا۔ ہمیں اپنے شعور کو فطرت کے وجود میں تحلیل کرنا نہیں آیا۔ اس کا فیصلہ دوسروں پر ہے کہ جو اقتباسات اب تک پیش کیے گئے ہیں ان میں مادیت اور مادیت میں محویت کے عناصر پیدا کرنے میں میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں۔

اب میں مضمون کے خاتمے پر پہونچ گیا ہوں۔ ایک انگریزی شاعر نے بچپن

کا بیان ان مصرعوں میں کیا ہے۔

"To see a world in a grain of sand
A Heaven in a wild flower
To hold divinity in the palm of your hand
And Eternity in an hour."

جن کے زیرِ اثر مندرجہ ذیل حصّہ "جگنو" نامی نظم کا مرتب ہوا۔

میں کیا بتاؤں وہ کتنی حسین دنیا تھی
جو بڑھتی عمر کے ہاتھوں نے چھین لی مجھ سے
سمجھ سکے کوئی اے کاش عہدِ طفلی کو
جہان دیکھنا مٹّی کے ایک ریزے میں
بہارِ لالۂ خود رو میں دیکھنا جنّت
وہ کیفِ منظرِ کونین اک گھروندے میں
اٹھا کے رکھ لے خدائی کو جو ہتھیلی پر
کرے دوام کو جو قید ایک لمحے میں
ثنا۔! وہ قادرِ مطلق ہے ایک ننھی سی جان
خدا بھی سجدے میں جھک جائے سامنے جس کے

میں اپنی نظم "تلاشِ حیات" کے آغاز میں جس بحر اور لب و لہجہ اور جن صوتیات کو کام میں لایا ہوں وہ سراسر انگریزی شاعری کی دین ہیں۔ وہی ٹھہراؤ، وہی سنجیدگی اور وہی سوچتی ہوئی آہستہ آہستہ بڑھنے والی آواز جو بسا اوقات انگریزی شاعری میں ہمیں مل جاتی ہے۔ البتہ آگے چل کر یہ ٹھہراؤ ایک چڑھتے سروں کا گا نا صعود (Crescendo) کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ میری

نظم "دھرتی کی کروٹ" میں وہی خیالات و تصویریں پیش کی گئی ہیں جو انگریزی ادب سے ہی حاصل ہو سکتی تھیں اور جنھیں والہانہ اور وجدانی اندازِ بیان دے کر زندۂ جاوید بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ "ہنڈولا" بھی میری وہ نظم ہے جو صرف فارسی یا اردو جاننے والا بڑے سے بڑا شاعر لکھ نہیں سکتا تھا اور جس کے اہم ترین حصے پر انگریزی شاعر ورڈزورتھ کے اثرات فوراً پہچان لیے جائیں گے۔ آخر میں "داستانِ آدم" نامی اپنی نظم کا ذکر کروں گا جس میں آغازِ آفرینش سے آج تک کی تہذیب و تمدن کے مناظر کو الف و مسائل ایک ڈرامائی انداز میں پیش کئے گئے ہیں اور جس کے وسیع البسط کینوس نے ہمارے نائب صدر ڈاکٹر ذاکر حسین کو خاص طور سے متوجہ کیا تھا۔



فارم ۴

اعلان بابت ملکیت شاہکار

اڈیٹر — محمود احمد ہنرؔ	مالکان مساوی — محمود احمد ہنرؔ، ممتاز الحق
قومیت — ہندوستانی	قومیت — ہندوستانی
پتہ — ۱۳۴ بخشی بازار، الہ آباد	پتہ — ممتاز باغ، لوکر گنج، الہ آباد
پرنٹر و پبلشر — ممتاز الحق	میں تصدیق کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا اطلاعات میرے علم کے مطابق صحیح ہیں۔
قومیت — ہندوستانی	ممتاز الحق
پتہ — ممتاز باغ، لوکر گنج، الہ آباد	۱۶ مارچ ۱۹۶۶ء

عابد علی عابد

شبِ نشاط، بہ عذرِ قدومِ یار برس
کبھی تو ڈھنگ سے اے ابرِ نو بہار برس
ہوا کے راگ پہ ہے تیرا شور، تال کی ڈور
جو بار بار ضرورت ہو، بار بار برس
اس آرزو میں کہ اک رات وہ بھی ہوں تو بھی
ابد کی گود میں کاٹے ہیں تین چار برس
شہوں کے قصر تو شاداب ہیں بہر موسم
کہیں بہ پاسِ گدایانِ رہگذار برس
تجھے قسم مری مژگانِ غم کی، ابرِ کرم
بیادِ محفلِ یاراں و بزمِ یار برس
وہ کفش ہائے زرفشاں، وہ آنچلوں کے نشاں
برائے زینتِ خوبانِ طرحدار برس
کلائیوں کی وہ شمعیں، وہ پھول سے چہرے
برائے ماہ جبینانِ گلعذار برس
برس کہ گردِ کدورت دلوں سے دھل جائے
بہ جمعِ خاطرِ احبابِ غمگسار برس
غزل عزیز کی، مصرع عزیز کا عابد
"برس برس کے دن اے ابرِ نو بہار برس"

ماہر القادری

ساقی بھی دورِ جام بھی، بادل گھرے ہوئے
اور میرا حال یہ کہ میں توبہ کئے ہوئے
ان کو غرورِ حسن ہے، مجھ کو سرورِ عشق
وہ بھی نشے میں چور ہیں، میں بھی پیئے ہوئے
عارض کی سرخیوں میں جھلکتی ہوئی حیا
لوگوں کے دیکھنے کی شکایت لئے ہوئے
اس محفلِ نشاط میں، اس بزمِ ناز میں
اے موجِ بادِ صبح! مجھے بھی لئے ہوئے
وہ کر رہے ہیں پرسشِ احوال اس طرح
آنکھوں میں رنگِ طنز، ہنسی روکے ہوئے
نقشِ قدم پہ دوست کے سجدوں کے ساتھ ساتھ
آنکھوں سے چن رہا ہوں ستارے گرے ہوئے
یہ حال ہو گیا ہے کہ جھونکے نسیم کے
آتے ہیں اب قفس میں مجھے چھیڑتے ہوئے
میں خود پہل کروں کہ ادھر سے ہو ابتدا
برسوں گزر گئے ہیں یہی سوچتے ہوئے
شاید اب اس کے بعد قیامت نہ آئے گی
ماہر! وہ دل کا حال وطن چھوڑتے ہوئے

احمد ندیم قاسمی

احساس میں پھول کھل رہے ہیں
پت جھڑ کے عجیب سلسلے ہیں

کچھ ایسی شدید تیرگی ہے
آنکھوں میں ستارے تیرتے ہیں

دیکھیں تو ہوا جمی ہوئی ہے
سوچیں تو درخت جھومتے ہیں

سقراط نے زہر پی لیا تھا
ہم نے جینے کے دکھ سہے ہیں

وہ غم تو ہمیں ہیں جاں سے پیارے
جو غم ترے پیار نے دیئے ہیں

ہم عکس ہیں ایک دوسرے کا
چہرے یہ نہیں ہیں، آئینے ہیں

ق

لمحوں کا غبار چھا رہا ہے
یادوں کے چراغ جل رہے ہیں

سورج نے گھنے صنوبروں میں
جالے سے شعاعوں کے بُنے ہیں

ق

یکساں ہیں فراق و وصل دونوں
یہ مرحلے ایک سے کڑے ہیں

پا کر بھی تو نیند اڑ گئی تھی
کھو کر بھی تو رتجگے ملے ہیں

ق

جو دن تری یاد میں کٹے تھے
ماضی کے کھنڈر بنے کھڑے ہیں

جب تیرا جمال ڈھونڈتے تھے
اب تیرا خیال ڈھونڈتے ہیں

ہم دل کے گداز سے ہیں مجبور
جب خوش بھی ہوئے تو رو دیئے ہیں

دل کی بھی خبر لو، چارہ سازو
دامن کے تو چاک سی لیئے ہیں

ہم زندہ ہیں، اے فراق کی رات!
پیاری، ترے بال کیوں کھلے ہیں؟

خلیل الرحمٰن اعظمی

یہ الگ بات کہ ہر سمت سے پتھر آیا
سر بلندی کا بھی الزام مرے سر آیا

زندگی چھوڑنے آئی مجھے دروازے تک
رات کے پچھلے پہر، میں جو کبھی گھر آیا

بس دُعا ہے کہ الٰہی یہ کوئی خواب نہ ہو
کوئی سایہ مرے سائے کے برابر آیا

کیا کہیں اب تو یہ عادت نہیں جاتی ہم سے
جھوٹ بھی بولے تو سچ بن کے زباں پر آیا

بارہا سوچا کہ اے کاش نہ آنکھیں ہوتیں
بارہا سامنے آنکھوں کے وہ منظر آیا

میں نہیں حق میں زمانے کو بُرا کہنے کے
اب کے میں کھا کے زمانے کی جو ٹھوکر آیا

سرخیِ مے بھی ٹھہرتی نہیں ہر چہرے پر
بوالہوس بھی اسی میخانے سے ہو کر آیا

ناصر کاظمی

دکھ کی لہر نے چھیڑا ہوگا
یاد نے کنکر پھینکا ہوگا

آج تو میرا دل کہتا ہے
تُو اس وقت اکیلا ہوگا

آنگن میں پھر چڑیاں بولیں
تُو اب سو کر اُٹھا ہوگا

بال جھٹکتے آنکھیں ملتے
گھر کا دریچہ کھولا ہوگا

موتی جیسی شکل بنا کر
آئینے کو تکتا ہوگا

دروازے پر دستک سُن کر
تُو کس ناز سے پہنچا ہوگا

میرا ساتھی، شام کا تارا
تجھ سے آنکھ ملاتا ہوگا

میں تو آج بہت رویا ہوں
تُو بھی شاید رویا ہوگا

ناصر تیرا میت پرانا
تجھ کو یاد تو آتا ہوگا

مظہر امام

اپنے رستے ہوئے زخموں کی قبا لایا ہوں
زندگی! میری طرف دیکھ اگر "میں" آیا ہوں

تشنگی حد سے سوا تو نہ تھی مے خواروں کی
جانے کیوں جام اٹھاتے ہوئے تھرّایا ہوں

کام آئی ہے وہی زلف، جو میری نہ ہوئی
وقت کی دھوپ میں جس وقت میں کملایا ہوں

خیریت پوچھنے والے ہیں بہت سنجیدہ
جرم اتنا ہے کہ اک شوخ کا ہمسایا ہوں

صبح ہو جائے تو اس پھول کو دیکھوں کہ جسے
میں شبستانِ بہاراں سے اٹھا لایا ہوں

عصرِ نو! مجھ کو نگاہوں میں چھپا کر رکھ لے
ایک مٹتی ہوئی تہذیب کا سرمایہ ہوں

زبیر رضوی

کیسے کیسے دلِ بیتاب کے ارماں ترسے
تم وہ بادل تھے جو دھرتی پہ نہ کھل کر برسے

وقت بے رحم ہے ہاتھوں سے کہیں چھین نہ لے
وہ جو ہم مانگ کے لائے ہیں تمہارے در سے

کوچہ کوچہ پھرے ہم لے کے بہت جنسِ وفا
کوئی کھڑکی نہ کھلی کوئی نہ جھانکا در سے

کون آئے گا تعاقب میں ہمارے دیکھیں
سوئے صحرا چلے ہم روٹھ کے اپنے گھر سے

کتنے لوگوں نے ہمیں قرب کی دولت بخشی
ایک ہم تھے کہ نہ کھل پائے کسی کے ڈر سے

وہ نہ دن آئے کہ شہرت ملے تحریروں کو
ایک خاموش تعلق رہے نامہ بر سے

ہم وہ دیوانے جو سر اپنا اٹھا کر ہی چلے
لاکھ طوفان بلا گزرے ہمارے سر سے

ہم بھی مصلوب ہیں اس عہد میں عیسیٰ کی طرح
نام لکھیئے گا ہمارا بھی تو آبِ زر سے

اختر ہوشیارپوری

میں نے یوں دیکھا اسے جیسے کبھی دیکھا نہ تھا — اور جب دیکھا تو آنکھوں پر یقیں آتا نہ تھا

ریگِ ساحل تھا بہارِ ساحلِ دریا نہ تھا — پھر بھی قدموں میں رہی ہے موج میں پیاسا نہ تھا

بام و در سے سخت بارش میں بھی اٹھے گا دھواں — یوں بھی ہوتا ہے محبت میں کبھی سوچا نہ تھا

آندھیوں کو روزنِ زنداں سے ہم دیکھا کیے — دور تک پھیلا ہوا صحرا تھا نقشِ پا نہ تھا

لوگ لائے ہیں کہاں سے شب کو مر مر کے چراغ — ان چٹانوں میں تو دن کو راستہ پیدا نہ تھا

شہر کی ہنگامہ آرائی میں کھو کر رہ گیا — میں کہ اپنے گھر میں بھی مجھ کو سکوں ملتا نہ تھا

تم سے پہلے راستوں میں قمقمے روشن نہ تھے — شہر کی دیوار سے صحرا نظر آتا نہ تھا

نت نئے انداز سے رہتی تھی ان سے گفتگو — دوستوں میں جب مرا رنگِ سخن رُسوا نہ تھا

برف اپنے آپ گھل جاتی ہے سورج ہو نہ ہو — شام سے پہلے یہ جانا تھا مگر سمجھا نہ تھا

ان دنوں بھی شہر میں سیلاب آتے تھے بہت — وادیوں پر جب کہیں بادل ابھی برسا نہ تھا

دامنِ گل تک نہ تھا محفوظ گردِ راہ سے — ہاں مگر تیرے شہیدوں کا کفن میلا نہ تھا

رات کی تنہائیوں میں جس سے چونک اُٹھتے تھے ہم — اپنی ہی آواز تھی شعلہ کوئی چمکا نہ تھا

وہ بھی سچ کہتے ہیں اختر لوگ بیگانے ہوئے
ہم بھی سمجھے ہیں کہ دنیا کا چلن ایسا نہ تھا

کمار پاشی

کئی صدیوں سے ساحل پر کھڑا ہوں
میں آنکھوں سے سمندر ناپتا ہوں

دِشائیں چھوڑ رہی ہیں آج مجھ سے
نکل کر خود سے باہر آگیا ہوں

ترا ہی زہر ہے میرے لہو میں
مجھے پی جا! میں نشہ موت کا ہوں

زوالِ شب کا ہر منظر ہے مجھ میں
میں سورج سے بھی پہلے جاگتا ہوں

مجھے پہچان لو اس خاک و خوں میں
میں صدیوں بعد پھر ظاہر ہوا ہوں

یہ رنگ و نور کا جادو عجب ہے
کہ تجھ سا ہوں مگر تجھ سے جدا ہوں

جو آب اس دشتِ امکاں میں نہیں ہے
میں پاشی جی اُسی کا نقشِ پا ہوں

اختر نظمی

بج اٹھیں پائلیں جھنکار سے پہچان گئے
ہم انھیں شوخیٔ رفتار سے پہچان گئے

میری روداد سے لوگوں نے نہ جانا مجھ کو
داستانِ رسن و دار سے پہچان گئے

مجھ سے واقف تو نہ تھے شہرِ نگاراں والے
التفاتِ نگہِ یار سے پہچان گئے

صرف آواز سنی تھی انھیں دیکھا کب تھا
اپنے احساس کی جھنکار سے پہچان گئے

سُرخیٔ خونِ تمنّا مرے کام آ ہی گئی
وہ مجھے دیدۂ خوں بار سے پہچان گئے

وہ جو ہر بات پہ انکار کی عادت ہے تمھیں
ہم تمھیں بس اسی انکار سے پہچان گئے

آشنا کوئی نہ تھا بزمِ سخن میں نظمی
لوگ مجھ کو مرے اشعار سے پہچان گئے

مظفر حنفی ہسوی

"منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی"
میری غزل سے سیکھ ادائیں نئی نئی

انگڑائیاں جو یاد پڑیں رات آپ کی
زنجیر کی ہر ایک کڑی ٹوٹتی گئی

اس نے بچا بچا کے نظر داستاں مری
کچھ اس طرح سُنی کہ بظاہر نہیں سُنی

عرصے کے بعد اب جو میسر ہوئی خوشی
آنسو نہیں رہے کہ اتر جائے آرتی

کچھ اس ادا سے بزم تری چونک سی پڑی
جیسے مرے بغیر نہایت اُداس تھی

ہاں اے نگاہِ ناز ذرا دیکھ بھال کے
دل کو فریب کھانے کی عادت نہیں رہی

کیسے کریں دنا کی تمنا جناب سے
یہ سوچتے ہوئے بھی ہمیں شرم آئے گی

یوں شوق سے بیانِ قیامت سنائیے
لیکن جنابِ شیخ کبھی بات بھی بنی؟

یہ طنز، یہ زبان مظفر انھیں کی ہے
مطعونِ رامپور جو ہیں شادِ عارفی[1]

---

[1] استادِ محترم

اخگر مشتاق رحیم آبادی

جینے کے اگر چند سہارے بھی ملے ہیں
تو جان سے جانے کے اشارے بھی ملے ہیں

ہر چند رہِ عشق کے غم سخت ہیں لیکن
اس راہ کے کچھ غم ہمیں پیارے بھی ملے ہیں

کچھ اپنی وفاؤں سے بھی اُمید تھی ہم کو!
کچھ ان کی نگاہوں کے سہارے بھی ملے ہیں

اے راہروِ راہِ جنوں بھول نہ جانا
اس راہ میں جی جان سے ہارے بھی ملے ہیں

الزامِ تغافل ہمیں تسلیم ہے لیکن
بدلے ہوئے انداز تمھارے بھی ملے ہیں

کیا کیجیئے تدبیر سے کر ہارا نہیں جاتا
گو راہ میں تقدیر کے مارے بھی ملے ہیں

طوفاں میں سبھی ڈوب تو جاتے نہیں اخگر
کچھ لوگوں کو طوفاں میں کنارے بھی ملے ہیں

منظور عارف

جرسِ دل کی صدا بن کے چلے
تُو اگر راہنما بن کے چلے

موجِ بے مایہ کی رفتار چلوں
تُو اگر آبلہ پا بن کے چلے

آرزو ہے کہ بنوں میں دریا
اور تُو مجھ پہ ہوا بن کے چلے

کاش گلشن میں گزاروں کوئی شب
تُو دمِ صبح، صبا بن کے چلے

میں رہوں دشت میں جا کر اور تو
چاندنی شب میں بلا بن کے چلے

عقل و دانش ترے قدموں پہ نثار
تو اگر ہوش رُبا بن کے چلے

شہزاد احمد

گھٹ گیا دم، کھولئے کھڑکی، ہوا لے لیجئے
منتظر کچھ لوگ ہیں، ان کی دعا لے لیجئے

کہہ رہی ہے اس کے ہونٹوں پر تبسم کی لکیر
خوں ہوا ہے دل تو اس کا خوں بہا لے لیجئے

دیکھئے اس کو چلے جس کا نشاں کوئی نہیں
سب سے پہلے آپ اپنا تو پتا لے لیجئے

دو قدم چلنا اگر دوبھر ہوا ہے آپ کو
آسرا گرتی ہوئی دیوار کا لے لیجئے

جاگتی آنکھیں، سلگتا دل، کہ تنہائی کے رنگ
ہے سفر درپیش اپنے ساتھ کیا لے لیجئے

دائمی کر دیجئے جاتی ہوئی فصلِ بہار
آنکھ کی پتلی میں تصویرِ صبا لے لیجئے

راستہ تاریک ہے، درپیش ہے شب کا سفر
اپنے سر پر دن کے سورج کی ردا لے لیجئے

بس یہی ہوگا کہ دیوانہ کہیں گے اہلِ بزم
آپ چپ کیوں ہیں، مری طرزِ نوا لے لیجئے

اس طرح شہزاد کیسے کٹ سکے گی زندگی
ایک غم اپنی بھی طاقت سے سوا لے لیجئے

شمیم حنفی

اے رُودِ عصر تجھ سے یہی التماس ہے
مجھ کو خوشی نہ دے کہ مجھے غم کا پاس ہے

چاندی پگھل کے نیل کے ساگر میں مل گئی
بس اک متاعِ داغِ المِ دل کے پاس ہے

ہیں آسمان پر ترے آنچل کے قمقمے
گل میں رچی ہوئی ترے جوڑے کی باس ہے

خونِ شفق ہے غازۂ رخسار و لعل لب
خنکیٔ نور تیرے بدن کا لباس ہے

تم نے ہزار درد کے تحفے دیئے مگر
اس دل کو کیا کریں کہ بہت ناسپاس ہے

خود آپ اپنی گرد بھی دنیا نہ پا سکی
دعویٰ یہ ہے کہ خود نگر و خود شناس ہے

ہنسنے کی بات آئی تھی اس پر بھی رو دیئے
ہر لمحہ زندگی کو ترے غم کا پاس ہے

دل کر رہا ہے ماتمِ یک شہرِ آرزو
چاروں طرف ہجوم تماشائے یاس ہے

دیکھیں تو اک زمانہ جنوں پر ہے خندہ زن
سوچیں تو تار تار خرد کا لباس ہے

وقار خلیل

دستِ گل میں ہے نیا سازِ وفا اب کے برس
رقص کرتی ہوئی پھرتی ہے صبا اب کے برس

دل کی راہوں میں نئے پھول کھلیں گے شاید
یادِ محبوب کی چلتی ہے ہوا اب کے برس

شب کی بھیگی ہوئی پلکوں سے اُڑا کر خوشبو
یوں نہ اِترا کے چلے بادِ صبا اب کے برس

رقص سے تیز کرو، ساغرِ غم چھلکاؤ
کتنی بوجھل ہے بہاروں کی صدا اب کے برس

شمعِ اُمید ہے لرزاں سرِ محرابِ وفا
فرقِ احساس پہ ہے تیغِ جفا اب کے برس

اتنا مایوس نہ کر اے شبِ ہجراں ہم کو!
پھر نہ اُٹھ جائیں کہیں دستِ دعا اب کے برس

آمدِ فصلِ بہاراں کے ترانے لے کر
درِ زنداں پہ رُکی آ کے صبا اب کے برس

پیار کے گوہر و الماس لٹائے گی وقار
اپنے خوابوں کی فسوں کار گھٹا اب کے برس

کیف احمد صدیقی

یہ حسن یہ نازک بدنی کس کے لئے ہے
یہ رنگ یہ گل پیرہنی کس کے لئے ہے

یاد آیا ہے شاید کوئی محرومِ تبسم
یہ نازشِ غنچہ دہنی کس کے لئے ہے

یہ کس کے خیالوں نے کیا ہے تمھیں گم صم
یہ خامشی و کم سخنی کس کے لئے ہے

آنچل سے چھپائے ہوئے یہ چہرۂ روشن
در پردہ یہ جلوہ فگنی کس کے لئے ہے

یہ کیف میں ڈوبی ہوئی سرشار ادائیں
رہ رہ کے یہ اعضا شکنی کس کے لئے ہے

قمر اقبال

ذہن میں یادوں کا زہریلا دھواں پھیلا رہا
صبح تک دل کا دیا جلتا رہا بجھتا رہا

لوٹ کر گزرے ہوئے لمحے نہ آئے پھر کبھی
گو درِ دل ان کی خاطر زندگی بھر وا رہا

کوچۂ تنہائی کے جلتے ہوئے ماحول میں
کوئی اپنی بے بسی پر دیر تک ہنستا رہا

تلخیٔ حالات گھل کر رہ گئی آواز میں
اب کہاں پہلا سا وہ اپنا لب و لہجہ رہا

بن گیا وہ جانِ محفل ایک نغمہ چھیڑ کر
شہر میں جب تک مغنی چپ رہا تنہا رہا

ذہن میں کھلتے رہے کتنے خیالوں کے کنول
رات کے ماتھے پہ جب تک چاند کا ٹیکا رہا

اس سے ملنے کی توقع تو نہ تھی لیکن قمر
احتیاطاً روز و شب میں کو بہ کو پھرتا رہا

ہمیشہ
مور چھاپ بیڑی
پیجئے



بہترین تمباکو، صاف پتّے
اور
ہوشیار کاریگروں
سے
تیار کی جاتی ہے

رفیق اینڈ سنس بیڑی والا احمد گنج الہ آباد

شفیق الرحمٰن

کون؟

کون ہے

میری جواں سال اُمنگوں کا سہارا

میرے ہمدم میرے دوست!

کس کے شب رنگ و معطر گیسو

میرے بازو پہ بکھر جاتے ہیں؟

کس کے خوابیدہ شبستانوں میں

کیف آمیز اندھیرے لے کر

نیند کی دیوی، تکلف کے بغیر

میری پلکوں،

مری آنکھوں میں دبے پاؤں چلی آتی ہے

سوئے جب گردش رفتار سے گھس جاتے ہیں

سوزنِ سادہ سے کون ان کو رفو کرتا ہے؟

میری بکھری ہوئی بوسیدہ کتابیں آخر

کون چن دیتا ہے ترتیب سے الماری میں

سلوٹیں دیکھ کے ملبوس پہ خم کھائی ہوئی

استری کون کیا کرتا ہے؟

آنکھ کس کی مرے بوٹ پہ جمی رہتی ہے

کون ہر ماہ چکا دیتا ہے دھوبی کا حساب؟

جب کبھی زندگی درماندہ و واماندہ نظر آتی ہے

اور بن جاتی ہے اک خوں بھرا جام

تلخیاں روح میں رچ جاتی ہیں

تہہ بہ تہہ ظلمتیں جم جاتی ہیں

زیست اور موت میں رہتا نہیں ننھا سا تفاوت باقی

ایسے لمحوں میں سدا

کون دیرینہ رفیق آ کے پکڑتا ہے مجھے بازو سے؟

اور لاتا ہے سوئے بزم

جہاں میرا لہو کھول کے تپ جاتا ہے

تو بتا سکتا ہے کیا؟

ہاں ذرا میں بھی تو سنوں

کیا کہا ——؟

تیرے گستاخ تبسم پہ ہنسی آتی ہے

تیرا وجدان ابھی تک ہے بہت خام اے دوست!

کیا بتاؤں میں تجھے۔

وہ کوئی اور نہیں ——

وہ تو میں خود ہوں ——

مری جان، مرے ہمدم، مرے دوست!

واہی

الزام

قبیلۂ شعرا کو ہے یہ شکایت عام
بجائے اس کے کہ دیں برمحل سخن کی داد
کبھی تو ہیں بُزِ اخفش کی طرح چپ بیٹھے
کبھی تمسخر و تضحیک کی چلا کے غلیل
مرا مشاہدہ اس باب میں کچھ اور بھی ہے
مشاعرے میں وہ اک سطحِ مرتفع کہ جہاں
وہ خاص صف کہ جہاں کی فضا ادب آموز
سماں وہاں کا کلب گھر سے کم نہیں ہوتا
پرانے دوست ملے ہیں جو بعد مدت کے
کسی کے لب پہ یہ شکوہ کہ بھیڑ تھی جو بہت
لتا کی دھن میں کوئی گنگنا رہا ہے غزل
غنودگی کے ہے عالم میں کوئی سر بہ سجود
جگالیاں کوئی کرتا ہے پان کھا کھا کر
بنا رہا ہے فضا میں دھوئیں کا مرغولہ
کسی کو حفظ مراتب کی فکر لاحق ہے
ہر اک کے دل میں یہ خواہش کہ سب سنیں اُس کو
کھڑا ہو کوئی بھی مائک پہ رنگ ہے یکساں
نظر ملی تو ذرا مسکرا کے دیکھ لیا

مشاعرے میں جو آتے ہیں شاعران کرام
بجائے اس کے کہ سنتے رہیں بغور کلام
کبھی تلے ہوئے دینے کو داد بے ہنگام
ہیں کرتے درہم و برہم مشاعرے کا نظام
نہیں ہے جس میں ذرا بھی مبالغے کا قوام
قریبِ صدر فروکش ہیں شاعرانِ عظام
وہ خاص صف کہ جو ہے مرکزِ نگاہِ عوام
سخنوروں کے لئے ہے وہ خوش گپی کا مقام
تو ہو رہا ہے بہ اخلاصِ دل سلام و کلام
تو رات بھر نہ وہ گاڑی میں کر سکا آرام
کہ خوش گلوئی میں ہے آجکل اُسی کا نام
کوئی ہے گھات میں حاصل کرے شراب کا جام
کوئی چبانے میں مصروف چینیا بادام
سگار پی کے کوئی شاعرِ خجستہ کام
پکارا جائے فلاں سے نہ پہلے میرا نام
مگر وہ دوسرے شاعر کا خود سنے نہ کلام
فراقِ شعر سنائیں کہ حرمت الاکرام
پھر اس کے بعد نہ شاعر ہے ذہن میں نہ کلام

ادب کے محتسبوں کو یہ غور کرنا ہے
کہ سامعین کہاں تک ہیں موردِ الزام

شاہد صدیقی

الیکشن

تذکرۂ دہلیٔ مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
اس میں اک غالبِ مغفور رہا کرتے تھے
ذوق و مومن سے بہت دور رہا کرتے تھے
انتخابات میں گرمی نہیں آئی تھی ابھی
ورنہ وہ بھی کسی حلقے سے کھڑے ہو جاتے
پھر بھی جب ان کے مقابل ہوئے دلّی والے
شدتِ غیض میں گھبرا کے انھوں نے یہ کہا
"دیکھیں کہہ دے کوئی اس سہرے سے بڑھ کر سہرا"
حضرتِ ذوق کی جانب سے ملا ان کو جواب
"دیکھو اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا"
کشمکش دونوں کی جاری تھی بہ اندازِ جنوں
دفعتاً شاہِ ظفر ذوق سے فرمانے لگے
"مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جاؤ گے"
پھر مخاطب ہوئے غالب سے کہ اے برخوردار
"امتحاں ہے ترے ایثار کا خودداری کا"
یہ تخاطب ابھی جاری تھا کہ مومن آئے
منہ میں اک پان لئے ہاتھ میں دیوان لئے
ان کو دیکھا تو کہا شاہِ ظفر نے ہنس کر
"آجکل رونقِ اردوئے معلّٰی تم ہو"

انتخابات کا عالم ہے کھڑے ہو جاؤ
رائے دینگے تمھیں دلّی کے صغیر اور کبیر
"ہار جاؤ تو سمجھنا کہ یہی تھی تقدیر"
اس پہ مومن نے بڑی شان سے شرما کے کہا
"آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہونگے"
آج بھی ملک میں ہوتے کو ہیں ہر سمت چناؤ
کوئی پیتا ہے گرما کوئی کھاتا ہے پلاؤ
مگر افسوس نہ غالب ہیں، نہ مومن نہ ظفر
ہستیٔ شاہد مطلق ہے کہ عالم کوئی
کوئی کہتا ہے مجھے کاش ٹکٹ مل جائے
اور ٹکٹ جس کو ملا ہے اُسے حلقہ نہ ملا
انتخابات میں جو لوگ کھڑے ہوتے ہیں
اپنے چھوٹوں سے بہر حال بڑے ہوتے ہیں
پھر بھی دیدیتے ہیں جب ووٹ انھیں اہلِ وطن
ان کے نعرے سے لرز اُٹھتے ہیں سب کوہ و دمن
"عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا"
جب کوئی ہار کے شرمندہ و مقروض ہوا
"یاد آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا"

تبصرے

عمیق حنفی — (عمیق حنفی کی منتخب ۲۹ نظموں کا مجموعہ)

انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ نے ہمارے مشہور و معروف شعراء کا جو انتخابی سلسلہ عرصہ قبل شروع کیا تھا، یہ مختصر مجموعہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

ہماری جدید ترین نسل کے شاعروں میں عمیق حنفی بڑا منفرد اور ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ اس مجموعے سے پہلے "سنگ پیراہن" کے نام سے ان کا مجموعۂ کلام شایع ہو چکا ہے جس کی معنوی خصوصیت نے اردو کے تمام اہل نظر کو اپنی جانب متوجہ کیا ہے۔ ہمارے وہ بزرگ بھی جو جدید شاعری کے سلسلے میں ہونے والے نت نئے تجربات کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے ان کے حلقوں میں بھی "سنگ پیراہن" کا خیر مقدم بڑی خوش دلی کے ساتھ کیا گیا اور اس کا سبب یہ تھا کہ عمیق حنفی کے کلام میں اشاریت (Symbolism) کی تمام تر فنی و معنوی نزاکتوں و لطافتوں کے باوجود وہ ابہام نہیں جو پڑھنے والے کو کہنے والے کی تشریح کا محتاج بنا دیتا ہے۔ عمیق حنفی نے قدیم فنی و ادبی سرمایے سے بھی خاطر خواہ طور پر استفادہ کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں قدیم علامتوں کے ساتھ جدید مسائل و موضوعات کی جو ہم آہنگی ملتی ہے اس نے ان کی شاعری میں ایک انفرادی شان پیدا کر دی ہے۔ موسیقی مصوری اور دوسرے فنون لطیفہ سے گہری واقفیت نے جس کا ثبوت عمیق حنفی کے وہ مضامین ہیں جو ان موضوعات پر ہند و پاک کے جرائد میں شایع ہوتے رہتے ہیں۔ ان کی نظموں میں راگ اور رنگ کی فضا بھی پیدا کر دی ہے جو بظاہر بحر و وزن اور ردیف و قافیہ کی قید کے بغیر دشوار نظر آتی ہے۔

چونسٹھ صفحات پر مشتمل یہ مختصر مجموعہ پچھتر پیسوں میں انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ سے مل سکتا ہے۔ سرورق کی پشت پر مختصر تعارف میں پروفیسر آل احمد سرور کے یہ الفاظ بھی شامل ہیں کہ "وہ لوگ جو کسی مجبوری کی بنا پر ہر شاعر کا سارا کلام نہیں پڑھ سکتے، ہر شاعر کے رنگ سے ان انتخابات کے ذریعہ متعارف ہو جائیں گے اور ان میں ہر شاعر کے تفصیلی مطالعہ کی خواہش پیدا ہوگی۔" مجھے یقین ہے کہ یہ انتخاب ہر باشعور پڑھنے والے کو عمیق حنفی کے تفصیلی مطالعے کی جانب مائل کریگا۔

شمیم حنفی

حرف حرف ——— فیض احمد فیض ——— قیمت ۳ روپیہ

اپنے ہم عہدوں میں سب سے الگ تھلگ اور اپنی شاعری میں سب سے جدا جدا، ایک آواز سنائی دی۔

ستم کی رسمیں بہت تھیں لیکن، نہ تھیں تری انجمن سے پہلے
سزا خطائے نظر سے پہلے، عتاب جرم سخن سے پہلے

یہ فیض تھے! جنھیں لوگوں نے حیرت بھری نظروں سے دیکھا اور محبت بھری باہوں میں سمیٹا۔ اگر یہ صحیح ہے کہ کسی شاعر کی سب سے بڑی خوش نصیبی اور کامیابی اسی میں ہے کہ لوگ اس کی شاعری کو پیار کرنے لگیں تو فیض یقیناً سب سے خوش قسمت اور کامیاب شاعر ہیں کیونکہ لوگ ان کی شاعری کو پیار بھی کرتے ہیں اور ان کے کلام کو سراہتے بھی ہیں۔

'حرف حرف' میں فیض کے زنداں نامے کے بعد کی ساری تخلیقات اور وہ بھی جسے انھوں نے پہلے انتخاب میں ترک کر دیا تھا، سب کی سب شامل ہیں۔

اس زمانے میں جب کہ ساری چیزیں مہنگی ہو گئی ہیں یہ مجموعہ کتاب کار (پبلیکیشنز) رام پور (یو۔ پی) نے صرف تین روپئے میں شایع کیا ہے، جو بذاتِ خود ایک مستحسن کام ہے۔

شیر کیا سوچتا ہوگا؟ از سید رفیق حسین مرحوم

ناشر کتاب کار (پبلیکیشنز) رام پور یو۔ پی ——— قیمت ۲ دو روپیہ

جانوروں کی بھی ایک الگ نفسیات ہے۔ وہ لوگ جن کو شکار کا شوق ہے، وہ جانوروں کے بارے میں ایسے دلچسپ واقعات بیان کرتے ہیں کہ سننے والا تعجب میں پڑ جائے۔ مشہور شکاری جم کاربٹ کو شکار کے علاوہ جانوروں کی عادت اور ان کی نفسیات سے بھی دلچسپی تھی۔ اسی طرح سید رفیق حسین صاحب کو بھی شکار سے الگ ہٹ کر جانوروں کی نفسیات سے گہری دلچسپی تھی جسے انھوں نے مندرجہ بالا کتاب میں ایک افسانوی ڈھنگ سے بیان کیا ہے۔ کتاب نہایت دلچسپ ہے اور پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

محبوب اللہ مجیب



بُڑھاپا پُرسکون اور خاموش بیتے ایسے! شام کا ڈوبتا ہوا سورج جیسے!

زندگی کو جھنجھٹوں سے چھٹکارا ملتا ہے!

جب جوانی ہی میں بیمہ کا سہارا ملتا ہے!

ASP/LC/241URDU



ہندوستان کو اپنے کارخانوں میں کام کرنے والوں پر بڑا فخر ہے۔ وہ دن رات ملک کی ترقی اور حفاظت کے لئے ضروری ساز و سامان تیار کر رہے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ لڑائی بھلے ہی بند ہو گئی ہو، ہماری آزادی کو پاکستان اور چین سے اب بھی خطرہ ہے۔ ہاں یہ ایک زندہ حقیقت ہے، ہمارے کارخانوں مہ [illegible] نے والے ملک کی خدمت میں جٹے ہوئے ہیں۔

سوچیں تو! آپ ملک کے لئے کیا کر رہے ہیں؟

ایک عظیم ملک ہمارا
ایک عظیم قوم

DA 65/F8



ہندوستان کو اپنے کارخانوں میں کام کرنے والوں پر بڑا فخر ہے۔ وہ دن رات
مُلک کی ترقی اور حفاظت کے لئے ضروری ساز و سامان تیار کر رہے ہیں۔ یہ
وہ سمجھتے ہیں کہ لڑائی بھلے ہی بند ہو گئی ہو، ہماری آزادی کو پاکستان اور چین
سے اب بھی خطرہ ہے۔ ہاں یہ ایک زندہ حقیقت ہے، ہمارے کارخانوں
میں [illegible]نے والے مُلک کی خدمت میں جُٹے ہوئے ہیں۔

سوچیں تو! آپ مُلک کے لئے کیا کر رہے ہیں؟

ایک عظیم مُلک ہمارا
ایک عظیم قوم

DA 65/F8

SHAHKAR Regd. No. Number 46
ALLAHABAD-1



ہندوستان کو اپنی عورتوں پر بڑا فخر ہے۔ گھر بھر کی آنکھوں کا تارا کوئی شوہر، کوئی بھائی، کوئی بیٹا گھر سے دُور مُلک کی سرحدوں کی حفاظت کر رہا ہے۔ وہ جانتی ہیں مُلک مُشکل حالات سے گزر رہا ہے۔ اور وہ ہر مُشکل کا مُسکراہٹ کے ساتھ سامنا کر رہی ہیں۔ وہ جانتی ہیں کہ موجودہ حالات میں بچت کرنا اور کسی بھی شے کو ضائع نہ جانے دینا بہت ضروری ہے۔ بہت سی عورتیں ہسپتالوں میں، خون کے بنکوں میں اور دوسری رضا کار جماعتوں میں کام کر کے اپنا فرض ادا کر رہی ہیں۔ بھارت کی لاکھوں کروڑوں عورتیں مُلک کی خدمت میں جُٹی ہوئی ہیں ——— سوچیں تو! آپ مُلک کے لئے کیا کر رہی ہیں؟

ایک عظیم مُلک ہمارا
ایک عظیم قوم

PA 65/24